Title – BAZM-E-AKBAR.

Creator – Qamar uddin Ahmad.

Publisher – Anjuman Taraqqi Urdu Hind (Delhi).

Date – 1944

Pages – 223

Subjects – Akbar Allahabadi – Sawaneh-o-Tanqeed; Tazkira Shora – Akbar Allahabadi.

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) نمبر ۱۴۵

بزم اکبر

یعنی

اکبر الہ آبادی کے سوانح حیات

اور

کلام پر تنقید

تالیف

مولوی قمر الدین احمد صاحب بدایونی

بی۔ اے، بی۔ ٹی (علیگ)

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

۱۹۴۴ء

بار دوم

قیمت مجلد للعہ غیر مجلد عہ

فہرستِ مضامین

کسی کے حالات زندگی پیش کرتے وقت ایک مؤلف کو متعدد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سب سے بڑی مشکل جو در پیش ہوتی ہے وہ صداقتِ بیان کی ہے۔ یہ دشواری اس صورت میں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ جس کی زندگی کے حالات تحریر کیے جا رہے ہیں اس سے مصنف کے تعلقات بھی ہوں، مصلحت اور محبت قدم قدم پر روکتی ہے کہ خصلت کے کم زور پہلو ترک کر دیے جائیں۔ اگر دل کے تقاضے پر توجہ کی جائے تو سیرت نامکمل رہ جاتی ہے اور انسان کی وہ اصل تصویر دنیا کے سامنے آتی ہی نہیں جس کو انصافاً پیش ہونا چاہیے تھا۔ میرے خیال میں یہ ایک فنّی بے ایمانی ہے کہ رنجیت سنگھ کو کسی تصویر میں آنکھ دبا کر بندوق کا نشانہ لگاتے ہوئے ایسا پیش کیا جائے کہ دنیا اس کو یک چشم نہ سمجھ سکے۔ کرامویل ایک مرتبہ تصویر کھنچوانے بیٹھا۔ بائیں رخسار پر تلوار کا ایک بدنما نشان تھا۔ مصوّر نے اس کو بچا دینے کے لیے چہرے کا رُخ بدلا، کرامویل اس کے ارادے کو تاڑ گیا، کہنے لگا "مہربانی فرما کر آپ میرے چہرے کی تصویر کھینچیے نہ کہ اپنے خیال کی۔"

یہ داغ میرے چہرے کا ایک جز ہی، یاد رکھو یہ تصویر میں نہ آیا
تو نامکمل فوٹو کی اُجرت تم کو کچھ نہ ملے گی "۔ میں نے الہ آباد کے
دوران قیام میں اکبر اور ان کے احباب وا قربا سے جو کچھ سُنا
اس کے متعلق ایک زمانے تک "چہ کنم" میں رہا کہ اکبر حسین کی زندگی
کے تمام پہلو منظرِ عام پر لاؤں یا نہیں۔ اگر اُخلاق کے ضعیف پہلو محو
کردوں تو بقولِ مرحوم یہی کہنا پڑتا ہی کہ ؎

تھے معزز شخص لیکن ان کی لائف کیا کہوں
گفتنی درج گزٹ باقی جو ہو ناگفتنی

اور اگر مرحوم کو ان کمزوریوں کے ساتھ پیش کردوں جو بہ تقاضائے
بشری ان میں تھیں تو اپنے احساساتِ محبت مجروح ہوتے ہیں۔ غرض کہ
اس الجھن نے بہت ستایا کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔ اس دوران میں مرزا
فرحت اللہ بیگ صاحب کی بیان کردہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی سچّی
کہانی کانوں میں پڑچکی تھی۔ غرض کہ اس کشمکشِ خیال کا آخری نتیجہ یہ نکلا
کہ جذبۂ حقائق نگاری نے دوسرے احساسات کو دبالیا اور میں اب
اکبر کو بالکل ویسا ہی پیش کررہا ہوں جیسا میں نے ان کو پایا۔ اس پر
اگر کسی صاحب کو رنج ہو تو وہ مرحوم کے اس اظہارِ صداقت پر نظر
کرنے کے بعد مجھے معاف فرمادیں ؎

نہ سہی حسنِ عمل خوبیٔ گفتار سہی
ہم تو اکبر میں بھی اک بات گنہگار سہی

دیگر

خوب اِک ناصحِ مشفق نے یہ ارشاد کیا ۔۔۔ بزم میں اس نے تعلّی جو کل اکبر کی سنی

فکر سے ذکر سے عبرت سے تجھے کام نہیں ۔۔۔ واہ وا کے لیے لفظوں کی دکاں تونے چنی
طبع میں تیری وہی خامئ حرص دنیا ۔۔۔ آتش خوف خدا سے نہ جلی ہو نہ بجھی
خود پرستی ہو بہت خلق کی خدمت کم ہو ۔۔۔ دل وہی کم ہو تو ہو دل شکنی چارہ گنی
تکیہ بر جاے بزرگاں نہ تواں زد بگزاف ۔۔۔ مگر اسباب بزرگی ہمہ آمادہ کنی

یہ تو پورے حالات پیش کرنے کی معذرت ہوئی، اب ان حالات کی ضرورت اور اکبر کی شاعری کی اہمیت کے متعلق کچھ عرض کرتا ہو۔

کارلائل کہتا ہو "جو لوگ اپنے عظیم المرتبت بزرگوں کے کارنامے فخر و ناز کے ساتھ نہیں دیکھتے انھوں نے گویا یہ طے کر لیا ہو کہ وہ خود عظیم المرتبت کبھی نہ ہوں گے"۔ اکبر نے خود بھی بہ صورت چیستاں یہی رونا رویا ہو۔ فرماتے ہیں ؎

نام ور ہم میں پہلے ہوتے تھے ۔۔۔ جو دکھاتے تھے دست و طبع کا زور
اب الف جھک کے اُن کا واؤ ہوا ۔۔۔ اور زمانے نے کہہ دیا نو مور

No more

صائب نے دُنیا کی ناقدری کا شکوہ کیا ہو اور کہتا ہو ؎

نباشد شعر من مشہور تا جاں در بدن باشد
کہ بعد از مرگ آہو نافہ بیروں می دہد بو را

اگر یہ سچ ہو تو زندگی بھر کے کارنامے جانے دیجیے، اکبر کے قبر میں اترنے کے بعد سے اہل ملک نے ایسے جوہر قابل کی قدر دانی کا کیا ثبوت دیا جو صوفیوں میں نمایاں صوفی تھا اور واعظوں میں خوش گفتار واعظ، رندوں میں کھلا ہوا رند تھا اور زاہدوں میں گوشہ نشین زاہد، قرآن خوانوں میں خوش گلو قرآن خواں تھا اور شاعروں میں بلند پایہ شاعر، رئیسوں میں اونچے درجے کا رئیس تھا اور مفلسوں

میں شکستہ حال نادار، ادیبوں میں چار زبانیں جاننے والا عمدہ ادیب تھا اور ہندسہ دانوں میں اعلیٰ مہندس، حکومت دوست لوگوں میں ممتاز حکومت دوست تھا اور سیاسی زندگی میں دو آتشہ کانگریسی، اجلاس پر سیکڑوں کا حاکم بالا تھا اور مسجد میں ڈفالی کے برابر کھڑا ہونے والا۔ گھر میں دو مختلف المعاشرت بیبیوں کا شوہر تھا اور بالاخانے والیوں کے سامانِ نمایش کا ایک تابندہ گوہر، عبادت خانے میں جن مرتعش انگلیوں سے تسبیح کے دانے پھرانے والا تھا انھی سے جلسۂ سرود میں بہترین ستار بجانے والا، غرض کہ ایک ہزل گو کے بقول کسی شعبے میں دیکھیے اس نے اپنی قوّت کا نمایاں مظاہرہ کیا ہے ؎

یہ چلبلی طبیعت جب پھاندنے پہ آئی
پروا نہیں بلا سے خندق ہو یا ہو کھائی

طبیعت کی متضاد کیفیات کو بدرجۂ اتم نباہ دینا معمولی قوّت والوں کا کام نہیں ہے۔ خود کہتے ہیں ؎

مے بھی ہوٹل میں پیو چندہ بھی دو مسجد میں
شیخ بھی خوش رہیں شیطان بھی ناراض نہ ہو

کلّیاتِ اکبر میں قدیم و پامال مباحث حسن و عشق، فلسفہ و عرفان اور فطرت نگاری کے علاوہ بے شمار مسائل ایسے ہیں جو دوسرے شعرا کے دوا وین میں یا تو بالکل مفقود ہیں یا نہایت ہی تشنہ۔ اکبر نے ضروری مسائل پر شرح و بسط کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ مثلاً ملکی و مشرقی شعار کی حفاظت، مغربی تمدّن سے نفرت، رعایا اور

راغی کے تعلقات اور ہر دو کے اسقام، سرسید سے اختلاف، تنگ خیال مولویوں کی پردہ دری، اخلاق و تعلیم کی اصلاح، اردو ہندی کا موازنہ، ہندو مسلم اتحاد اور اس کی مشکلات، فحش اور خلافِ متانت کلام وغیرہ اور یہ ایسے مباحث ہیں جن کے بارے میں ضروریاتِ حاضرہ کے مدِّنظر موافق یا مخالف عنوان پر قلم اٹھانا بہت ضروری ہے۔

میں نے اس خرمن کے یہ چند دانے پیش کیے ہیں، ان کو بڑھانا اور پروان چڑھانا صاحبانِ ہمت و ذوق کا کام ہے۔ ان پر نہ صرف مضامین بلکہ بسیط مقالے لکھے جا سکتے ہیں شیکسپیر کے کلام پر اہلِ مغرب نے ضخیم کتابیں لکھی ہیں اور شواہد پیش کر کے نئے نئے دعوے کیے ہیں۔ ایک مصنّف دعویٰ کرتا ہے کہ شیکسپیر سپاہی تھا اور اس کا آبائی پیشہ سپہ گری تھا۔ دوسرے کا ادّعا ہے کہ وہ کاشتکار تھا۔ تیسرے کا اعلان ہے کہ وہ ملاح تھا غرض کہ کوئی اُسے اداکار ثابت کرتا ہے کوئی ادیب، کوئی اس کے ڈاکٹر ہونے پر استدلال لاتا ہے تو کوئی اس کے انجنیر مزدور یا گورکن ہونے پر۔ نتیجہ سب کا یہی نکلتا ہے کہ اس نے جس مسئلے پر جو حکیمانہ بات کہہ دی ہے، وہ اٹل ہے۔ لوگ اس یقین پر مجبور ہو گئے ہیں کہ شیکسپیر اسی خاص ماحول میں پلا بڑھا تھا ورنہ مخصوص فنون و مباحث کے اتنے باریک نکتوں پر ان کی نظر کیسے پہنچتی شیکسپیر کی طرح ہمارے پریاگ کے ظریف فلسفی کی نگاہ بھی حقائق کی کچھ کم گہرائیوں تک نہیں پہنچی۔

اس نے جو بات کہہ دی ہے وہ پتھر کی لکیر ہو کر رہ گئی ہے۔ ضرورت

اس کی ہے کہ اہلِ نظر کاوش و تحقیق سے کام لیں اور بے توجہی کی دلدل میں گرے ہوئے اس گوہرِ اکبر کو نکال جوہریوں کے سامنے پیش کریں ؎

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا
سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

اکبر کی بدنصیبی ہے کہ وہ ہندستان میں پیدا ہوا ورنہ ایسے کثیر التعداد جوہروں کا انسان اگر یورپ یا امریکہ میں جنم لیتا تو وہاں کے قدرشناس لوگ اس کو نہ صرف زندگی میں آنکھوں پر بٹھاتے بلکہ بعدِ مرگ اس کی خدمات کی مناسب تشہیر کر کے تمام دنیا سے اس کی عظمت کا لوہا منواتے۔ حیدرآباد کے ایک مخصوص علمی ذوق کے حامل سوبلین مولوی سراج الحق صاحب ڈپٹی کلکٹر نے ایک دن بہت افسوس کا اظہار کر کے فرمایا کہ "اکبر کی ایک کھلی ہوئی بدنصیبی یہ ہے کہ اُن کے فرزند مولوی سید عشرت حسین صاحب نے سولہ سترہ سال سے اب تک چوتھا حصہ شایع کرنے کی فکر ہی نہ کی اور جو تیسرا حصہ شایع ہوا ہے وہ اس قدر پُر از اغلاط و بے ترتیب ہے کہ اسے دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے۔ اشتہار و اعلان نے اقبال کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور اکبر جیسا کوہِ وقار زمین میں دھنسا چلا جا رہا ہے"۔ میں نے کہا کہ اس کا مولوی سید عشرت حسین صاحب کو خود افسوس ہے۔ انھوں نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا "میں خوش ہوا کہ حیاتِ اکبر آپ لکھ رہے ہیں۔ میں خود کچھ حالات لکھ چکا ہوں اس لیے کہ مجھ سے زیادہ مشکل سے کسی کی واقفیت ہوگی۔ افسوس ہے کہ حصۂ سوم میں کتابت کی بہت غلطیاں ہیں۔ مجھے سرکاری کاموں سے فرصت نہ تھی، صحت کا کام ایک منشی کے سپرد تھا اب میں

نے پنشن لے لی ہے اور اپنے مکان میں مقیم ہوں۔ آیندہ کے لیے کوشش کروں گا کہ غلطیوں کی تعداد بہت کم ہو۔"

اکبر کا انتقال ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ہوا۔ کلیات کا تیسرا حصہ اگست ۱۹۲۱ء میں چھپ کر آ چکا تھا۔ ایسی صورت میں اب مرحوم کا جتنا کلام باقی ہے وہ وہی ہے جس کو انھوں نے کچھ مصالح کے مدِنظر اپنی زندگی میں چھاپنا مناسب نہ سمجھا۔ اس میں کے کچھ اشعار جو مجھے اس تاکید کے ساتھ سنائے تھے کہ ان کی زندگی میں شایع نہ کروں اس وقت پبلک کے سامنے آ رہے ہیں کچھ بہت گرم اور شخصی طور پر کھلے ہوے دل آزار قسم کے اشعار میں نے بھی شایع کرانے سے احتراز کیا ہے۔ باقی سب کلام مولوی سید عشرت حسین صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ خدا جانے اس حصّے کو شایع کرنے کی نوبت کب آئے گی۔ میں مولوی سید عشرت حسین صاحب کو توجہ دلا رہا ہوں کہ اسے جلد چھاپ دیں، کیوں کہ میری اس تالیف کے بعد پبلک کی تشنگی بہت بڑھ جائے گی۔ پندرہ بیس سال کا زمانہ بہت طویل گزر چکا ہے۔ حکومتیں، جماعتیں اور افراد پہلے کے مقابلے میں بہت کشادہ دل اور مائل بہ رواداری ہو چکے ہیں۔ جس بات کو بیس سال قبل خانگی صحبت میں بھی منہ سے نکالنا قابلِ زبان بندی سمجھا جاتا تھا اب وہی بات علانیہ بر سرِ منبر کہی جا رہی ہے۔ میرے ایک حیدرآبادی دوست لکشمی نراین پرشاد صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی نے سچ کہا کہ "اب اکبر کے اشعار جذبات سے نہیں عقل و عدل سے جانچنے کا زمانہ ہے۔" اکبر کے چٹکی لینے پر لوگوں کو منہ نہ بنانا چاہیے۔ دل سے داد اس کی دینی چاہیے کہ اس نے کن حالات میں کیسے کیسے نادر اسالیبِ بیان

سے کام لیا ہے۔ حصّۂ سوم اگست ۱۹۲۱ء میں شایع ہوا اس سے قبل کے
میرے نوٹ کردہ اشعار بیشتر غیر مطبوعہ تھے مگر چوں کہ بزمِ اکبر شایع
کرنے کا موقع حصّہ سوم کے نکلنے کے کوئی پندرہ سولہ سال بعد اب
آیا ہے، مجھے بڑی زحمت اس میں ہوئی کہ ایک ایک شعر کو کلیاتِ اکبر
میں بالخصوص حصّہ سوم میں تلاش کرنا پڑا۔ چونکہ حصّۂ سوم ترتیب وغیرہ
کے لحاظ سے نہایت ناقص چھپا ہے، ایک ایک شعر کے واسطے کئی کئی
گھنٹے صرف کرنے پڑے۔ اس دردسری کے باوجود بھی میں مطمئن نہیں
ہوں۔ ممکن ہے کہ کچھ اشعار جن کو میں نے غیر مطبوعہ یا مطبوعہ ظاہر کیا ہے وہ
مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نکل آئیں یا کچھ اور مغالطہ ہوگیا ہو تو صاحبانِ نگاہ
اس کو میری سہوِ نظری پر محمول فرمائیں۔ اکبر کی شاعری کے محاسن گنانا
اور ان کی خدمات کی تفصیل بتانا ایک کہی ہوئی بات کا دُہرانا ہوگا۔
میں یہ کام مرحوم کی زندگی میں کئی برس تک اپنے مضامین کے ذریعے
رسالۂ "نقیب" بدایوں میں انجام دیتا رہا ہوں۔ اس وقت مختصراً اتنا
عرض کرتا ہوں کہ اکبر کی شاعری محض عاشقانہ خروش کا اظہار یا تفنّنِ
طبع کا سامان نہیں ہے وہ ایک مرثیہ ہے قوم کی حالت کا، وہ ایک ڈراما
ہے معارف اور حقائق کی پردہ کشائی کا، وہ ایک بسوط تاریخ ہے عہدِ
حاضر کی۔ میرا یقین ہے کہ اگر ملک پر کوئی ناگہانی آفت آجائے اور
سیر و تواریخ کا سارا سرمایہ دریا بُرد ہو جائے تو اربابِ حل و عقد
محض کلیاتِ اکبر کو دیکھ کر زمانۂ موجودہ کی ایک تاریخ مرتّب کرسکتے ہیں
اور آیندہ نسلوں کو بتا سکتے ہیں کہ اس عہد میں ہندستان کے مذہبی،
تمدّنی اور سیاسی حالات کیا تھے، حاکم و محکوم کے تعلقات کیسے تھے اور

یہ بدنصیب ملک ان دنوں کن مراحلِ حیات سے گزر رہا تھا خواہ نثر ہو یا نظم آپ اکبر کے کلام میں ایک انوکھا طرزِ ادا پائیں گے۔ ۱۹۱۵ء میں اودھ پنچ میں ایک کسان کی دعا شایع کرائی ہے۔ اس کا اسلوبِ بیان ملاحظہ فرمائیے۔ کسان اپنا دردِ دل خدا سے بھی کہتا ہے تو اس طرح کہ صاحب کی شکایت نہ پیدا ہو۔ کسان کی زبان سے فرماتے ہیں:

"اے میرے اچھے خدا میں اعتقاد رکھتا ہوں کہ تیرا کوئی ساجھی نہیں تو لاٹ صاحب سے بھی بڑا ہے، میں یہ جانتا ہوں کہ حاکم بندوبست نے بغیر تیری مرضی کے مجھ پر جمع نہیں بڑھائی ہے، اے اللہ تو ہر جگہ ہے مگر اس موضع میں شاید تو نے گزر نہیں کیا اور اگر گزر کیا تو میری اجڑی حالت کو دیکھ کر مجھ کو اپنا بندہ نہ سمجھا اور اگر بندہ سمجھا تو گنہگار پایا اسی وجہ سے مجھ پر جمع بڑھوا دی۔ اے اللہ میرا گناہ معاف کر، وہ گناہ کچھ بڑا بھی نہیں ہے میں نے نیل والے صاحب کی ایک بھینس چرائی تھی مگر اس کے لیے دو مہینے کی سزا بھی بھگت لی۔ اس نے میرے کھیت کا نقصان کیا تھا میں نے اس کو باندھ رکھا تھا۔ اس کے سوا اور کوئی گناہ نہیں کیا نہ کسی کی زمین دبائی نہ مال چھین لیا۔ اے خدا اب مجھ پر فضل کر اور میری اس دعا کو بدلی کے لفافے میں لپیٹ کر تیز رَو بجلی کے ہاتھ صاحب لوگوں کے پاس بھیج دے اور حکم دے دے کہ ہنگی بھر غریب کسانوں پر مال گزاری کے واسطے زرا سختی نہ کریں"۔ اسی طرح سے جو بات نظم میں کہی ہے بڑی حکمت اور مصلحت کے ساتھ کہی ہے۔ اس کو تشبیہ، استعارہ، طنز یا ظرافت کے ایسے نادر غلاف میں لپیٹا ہے کہ جس میں سے گزر کر ہر کس و ناکس کی نظر بطونِ معانی تک نہ پہنچ سکے۔

انگلستان کے وزیر مسٹر بالفور کہتے ہیں" اگر قدیم مشاہیر آج بھی زندہ ہوتے تو ہر ایک کو ان تک اور ان کے خیالات تک رسائی کہاں نصیب ہوتی - ان کی ذمہ داریاں اور اُن کی مصروفیتیں اُن کو ہر ایک سے ہم کلام ہونے سے باز رکھتیں لیکن کتاب کے توسط سے ہم اُن سے ہر وقت مل سکتے ہیں اور ان کے حالات وخیالات سے آگاہ ہوسکتے ہیں ۔جب تک اچھی کتاب میسر ہے دنیا بے لطف نہیں ہوسکتی"! اپنی اس تالیف بزمِ اکبر میں مَیں نے سیکڑوں مطبوعہ و وغیر مطبوعہ اشعار پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کون کون سے اشعار مرحوم نے کن حالات وخیالات کے تحت کہے ہیں اور ظاہری باتوں کے علاوہ کیا کیا پنہاں اور گہرے مطالب کس کس طرح ادا کیے ہیں. جو لوگ زرا عمیق نظر سے کام لیں گے وہ نہ صرف مسرور بلکہ مسحور ہو جائیں گے ؎

ہاں اہلِ دردہے کوئی نقّادِ سوزِ دل
لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کیے ہوئے

قمرالدین احمد
بدایونی

باب اوّل

سوانح حیات

حسب ونسب

ضلع الہ آباد میں بارہ ایک مشہور قصبہ ہے۔ سید حسین علی اور سید عبداللہ جو تاریخ میں بادشاہ گر کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں اسی بستی کی خاک نے پیدا کیے تھے۔ خان بہادر سید اکبر حسین الہ آبادی کا سلسلۂ نسب اسی سرزمین کے خاندانِ سادات سے ملتا ہے۔ اس مولودِ مسعود نے جب ۱۸۴۶ء میں دنیا میں آکر آنکھیں کھولیں تو خود کو بارہ جیسے مردم خیز خطے کی آغوش میں پایا۔ اکبر حسین کے دادا سید فضلِ محمد ناظر امامیہ مذہب رکھتے تھے۔ سید فضلِ محمد کے تین بیٹے ہوئے۔ سید وارث علی۔ سید واصل علی اور سید تفضّل حسین۔ سید تفضّل حسین ایک صوفی منش درویش تھے، اُن کا انتقال ۱۳۰۳ھ میں ہوا، ذاتِ رب مادۂ تاریخ وصال ۱۳۰۳ھ قرار پایا ؎

چو شد واصلِ ذاتِ رب ذاتِ او
بجو سالِ تاریخش از ذاتِ رب

ناظم سید فضل محمد صاحب (شیعہ)

سید وارث علی صاحب　سید واصل علی صاحب (حنفی)　سید تفضل حسین صاحب (حنفی)
تحصیل دار بارہ (حنفی)

سید اکبر حسن　سید اکبر حسین

زوجۂ دوم فاطمہ صغریٰ (شیعہ)　زوجۂ اوّل خدیجہ خاتون (حنفی)

محمد ہاشم　عشرت حسین　عابد حسین　نذیر حسین

فوت بعمر ۴ سال　عرف بدل میاں

لاولد　عاشق حسین
فوت بہ زمانۂ جوانی

سید محمد سلیمان　سید مظفر حسن　سید محمد اسلم　سید محمد عقیل حسین

سید تفضل حسین کے دو لڑکے ہوئے۔ سید اکبر حسین و سید اکبر حسن،
اکبر حسن نے اچھی ترقی کی پہلے منصف ہوئے اس کے بعد اودھ کے
محکمۂ رجسٹریشن میں بمشاہرۂ چارسو روپے ماہوار انسپکٹر اوّل رہے لیکن
عین شباب میں انتقال کر گئے۔ اکبر حسین کے ماں باپ تایا سب
حنفی مذہب رکھتے تھے۔

تعلیم و تربیت

سید وارث علی بارہ میں تحصیل دار رہے تھے
انھوں نے اپنے بھتیجوں اکبر حسن و اکبر حسین کی تعلیم کی
نگرانی خود سے متعلق کر لی تھی۔ سید تفضل حسین بھی بھائی کے ساتھ ہی
رہتے تھے۔ تایا کو کیا معلوم تھا کہ خرد سال اکبر آیندہ مملکتِ سخن کی
جہاں گیری کرے گا اور عالم گیر شہرت کا مالک ہوگا۔ گا ہے ماہے ذہانت
آنکھوں آنکھوں میں کہہ جاتی تھی۔

شہید از قامتِ آں طفل واقف نیستی شاید
کہ ایں بالا بلا خواہد شدن بالیدہ بالیدہ

سید تفضل حسین صاحب اُردو فارسی اور حساب اچھا جانتے تھے، کچھ طلبہ مکان پر جمع ہو جاتے تھے ان کو اور اکبر کو خود تعلیم دیتے تھے۔ مشاہیر سے رشتہ ملانا اور تعلق پیدا کر دینا ہر شخص باعث فخر سمجھتا ہے۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۶۲ء تک بجز والد اور چچا کے کوئی پوچھنے والا نہ تھا کہ "یہ کھاتا کیا ہے" مرتب و مشہور ہونے کے بعد لوگوں نے اعلان کرنا شروع کیا کہ ہم اکبر کے اُستاد رہے ہیں۔ فرماتے تھے کہ "کچھ عرصہ ہوا تو ایک صاحب نے حیدر آباد (دکن) میں اعلان کیا کہ میں نے اکبر کو پڑھایا ہے۔ میں نے سنا تو کہا کہ ہاں مولوی صاحب کا ارشاد سچ ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ میرے بچپن میں الہ آباد میں ایک مولوی صاحب تھے وہ مجھے علم سکھاتے تھے اور میں انھیں عقل مگر دونوں ناکام رہے۔ نہ مولوی صاحب کو عقل آئی اور نہ مجھے علم۔" سید صاحب میرے مکان پر کثرے آتے تھے یا میں عشرت منزل جاتا تھا تو حالات پوچھتا رہتا تھا۔ ایک دن میں نے کہا کہ اپنی ابتدائی تعلیم و تربیت کا کچھ حال بیان فرمایئے تو فرمایا کہ والد صاحب ایک صوفی منش شخص تھے۔ مجھے تصوف اُن سے ورثے میں ملا ہے۔ والد صاحب انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے، میں نے انگریزی جو کچھ سیکھی وہ پرائیویٹ طور پر سیکھی۔ غدر ہوا ہے تو میں انگریزی پرائمر پڑھ رہا تھا، بعد کو ذاتی محنت سے اس زبان میں اتنی

ترقی کرلی کہ بزمانۂ ججی عدالتی تجاویز انگریزی میں لکھتا تھا۔ والد صاحب کو حساب اچھا آتا تھا ایک دن والد صاحب کے سامنے ایک طالب علم نے ایک سوال ٹنسوریشن کا پیش کیا۔ میں نے کہا دیکھوں میں نکال سکتا ہوں۔ والد صاحب نے کہا کہ تم نے ٹنسوریشن نہیں سیکھی ہو بغیر اس کے قاعدوں کے علم کے تم کیسے نکال سکتے ہو۔ میں نے سوال کی نقل کرلی اور رات کو دیر تک اس پر محنت کرتا رہا تا ایں کہ اُسے حل کرلیا۔ صبح کو والد صاحب نے جواب صحیح دیکھ کر ذہانت پر بہت داد دی اور پیار کیا۔ والد صاحب کے بتائے ہوئے مجھے حسابی سوالات حل کرنے کے اب بھی خاص خاص ایسے گُر معلوم ہیں جو دوسروں کو مشکل سے معلوم ہوں گے۔ مثلاً آپ ہزاروں لاکھوں کے اعداد مسلسل بولتے جائیے میں لکھتا جاؤں گا اور بغیر تاخیر فوراً ان کا حاصل جمع بتا دوں گا۔ میں نے عرض کیا اچھا لکھیے ایک پرزے پر۔ لکھنے کو تیار ہو گئے۔ میں نے حسبِ ذیل اعداد بولے، رعشہ دار ہاتھ سے لکھے:۔

۲۹۲۱

۴۵۰۶

۱۳۳۸

۵۹۸

سوال ختم ہونے کے ساتھ ہی درست جواب ۶۳ ۹۳ لکھ دیا۔

انگریزی کا استعمال تحریر میں اچھی طرح کر سکتے تھے مگر تقریر میں وہی تیتر بٹیر آدھی اُردو آدھی انگریزی چلتی تھی۔ کبھی تحریر میں بھی اُردو

انگریزی کا پیوند لگاتے تھے ۔ مثال کے طور پر ایک پرزے کی نقل پیش کرتا ہوں جو مجھے شہر سے کٹڑے میں مکھن کے متعلق بھیجا تھا" پانچ پیسے بھر کم سیر بھر مکھن پہنچا Many thanks سیر بھر اور چاہیے حکم دے دیجیے ۔ اکبر حسین ۱۷ ر اکتوبر ۱۹۲۰ء"۔ اس پرزے سے زبان کے علاوہ خیالِ سوٴ دو زبان پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ بازار کے گھی سے صحت اچھی نہیں رہتی تھی اس لیے مکھن فراہم کر کے اس میں سے گھی نکلوا کر استعمال کرتے تھے ۔

حیدر آباد کے ایک علم دوست عہدہ دارِ عدالت مولوی حمیدالدین محمود صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے دریافت فرمایا۔ "اجی خواجہ حسن نظامی صاحب کے شایع کردہ اکبر کے خطوط کیا ہیں مسلسل علالت نامے ہیں ، تمام خطوط میں سے چند ہی ایسے نکلیں گے جن میں خرابیٔ صحت کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔ اس کی وجہ کیا ہے ؟" میں نے کہا اوّل تو پیرانہ سالی ہی ایک مستقل بیماری ہے ۔ مرحوم عادتاً ایک اصولی شخص تھے اور چیزیں خرید کر کھاتے رہنے میں بہت محتاط ۔ البتہ احباب کے تحفے انھیں بیمار ڈالے رہتے تھے ۔

خوشی سے میں نے کیے یہ نفیس آم قبول
ادائے شکر میں اب ہو مرا سلام قبول

دوسروں کی حرص اور زیادہ خوری پر فقرے کستے تھے ۔

میں نے سحری کھانے پر کل ٹوکا تھا وہ جھنجھلائے تھے
اور آج جنابِ واعظ نے چورن سے فقط افطار کیا

مگر ادھر اُدھر کے آئے ہوئے تحائف سے اپنا منہ نہ روک سکتے تھے خود یہ مطبوعہ خطوط اس حقیقت کے شاہد ہیں - ۱۲ فروری ۱۹۱۷ء کو خواجہ صاحب کو لکھتے ہیں " لاٹ صاحب کے منشی صاحب نے تھوڑا مچھلی کا قورمہ بھیج دیا تھا، میں نے تھوڑا سا کھایا رات کو طبیعت صاف نہ تھی ایک گولی چورن کی کھائی - جگر نے اپنے کام میں قصور کیا صفراوی دست آنے لگے دو دن بعد قبض شدید ہو گیا۔ سر میں وہ شدید چکر کہ الاماں، راتیں مصیبت سے کٹیں، اب تک نجات نہیں ملی" اس افتاد سے آیندہ سبق لینا تھا مگر نہیں ؎

قضا کے راستے پر خود دلِ ناکام آتا ہے
اُدھر کو پانو بڑھتے ہیں جدھر سے دام آتا ہے
(ثاقب لکھنوی)

پھر ایک خط میں خواجہ کو لکھتے ہیں " خواجہ بانو کو خدا خوش رکھے میرا خیال رکھتی ہیں گاجر کا حلوا مجھ کو ناموافق نہیں ہے عمدہ گھی دودھ اور شکر ڈال کر جو بنتا ہے وہ مجھ کو مضر نہیں ہوتا" آخر عمر میں مسلسل بیمار رہنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ دوا بہت کم کرتے تھے متوجہ کرنے پر فرماتے تھے بیماری اپنا کورس پورا کرے گی تو خود چلی جائے گی طبیعت بھی بڑی حساس تھی خفیف سی تکلیف سے بہت متاثر ہو جاتے تھے - یہی وجہ ہے کہ ان مطبوعہ خطوط میں کم ایسے نکلیں گے جن میں کسی نہ کسی قسم کی خرابیٔ صحت کا رونا نہ رویا گیا ہو، خود فرماتے ہیں ؎

اب ہے بیماری ہی اکبر اپنا شغلِ زندگی
جب فقط مرنا ہی باقی ہے تو اچھا کیوں ہوں

عہدِ جوانی میں جس زمانے میں کلامِ اکبر پر تنقید کے سلسلے میں مضامین لکھتا رہتا تھا (ملاحظہ ہوں مضامین مطبوعہ "نقیب" بدایوں از ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۲ء) اور حیاتِ اکبر کے واسطے مواد یکجا کر رہا تھا تو اکبر نے فرمایا تھا ؎

لکھو لائف مری ایّامِ جوانی کے سوا
سب بتا دوں گا تمھیں افتد و دانی[1] کے سوا

افتد و دانی کے واقعات کو پردۂ خفا میں رکھنے کا اعلان صرف شعر کی حد تک تھا ان کی تفصیل وقتاً فوقتاً بتاتے رہتے تھے ؎ غ

لائف جو میری لکھتے ہو، ہے اس میں بات کیا[2]
مرتا رہا بتوں پہ پھر ایسی حیات کیا

شادیاں اکبر کی دو شادیاں ہوئیں پہلی شادی پندرہ برس کے سن میں ماں باپ نے ایک قصباتی ہم کفو سنّی لڑکی خدیجہ خاتون سے کر دی جو اکبر سے عمر میں چار سال بڑی تھی اکبر کا دل اس سے کبھی نہ ملا، بقول ایک ہزل گو کے ؎

باپ ماں نے پانو میں شادی کی بیڑی ڈال دی
ورنہ بیوی کی قسم کھاتا ہوں میرا دل نہ تھا

اس عالی دماغ شاعر کا حسین و بلند تخیل جو سلیقے اور دل ربائیاں چاہتا تھا۔ یہ دہقانی سیدانی اُن سے بالکل کوری تھی۔ اکبر کی پرخروش اور

---

[1] "افتد و دانی" حضرت شیخ سعدیؒ کی اس عبارت کا ٹکڑا ہے "در ایّامِ جوانی چناں کہ افتد و می دانی"

[2] جن اشعار سے پہلے "غ" علامت ہو اُن کو غیر مطبوعہ سمجھنا چاہیے۔

دیوانی جوانی ایسی شوخ وشنگ ہستی کی متلاشی تھی جو اُن کے اس بلند ذوق کی تکمیل کر سکے ؎

کم سن ہنسوں سے آپ کسی شب نہ چوکیے
جیسی گھڑی ہیں یہ انھیں ہر روز کوکیے

حسین تو ہے وہ مروّت نہیں اگر نہ سہی　　غضب کی آنکھ تو ہے لطف کی نظر نہ سہی

لپٹ بھی جا ارے اکبر غضب کی بیوٹی ہے
نہیں نہیں پہ نہ جا یہ حیا کی ڈیوٹی ہے

اکبر دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے　　لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے

جس وارفتہ مزاج کی نظریں حسینانِ شہر کی ان اداؤں کی داد دے چکی ہوں کہ ؎

نزاکت پر غضب ہے ان کا جوڑا اس قدر بھاری
دو پٹّا ہے مصیبت پائینچہ مشکل سے اُٹھتا ہے

تان اس بت نے اڑائی ہیں بلہا بولے
ہم تو ہم شیخ بھی توحید کا کلمہ بھولے

نیچری وعظ و تہذب کو لیے پھرتے ہیں
شیخ صاحب ہیں تو مذہب کو لیے پھرتے ہیں

✓ ہم کو ان تلخ مباحث سے سروکار نہیں
ہم تو اک شوخ شکر لب کو لیے پھرتے ہیں

وہ بھلا ایک قدیم خیال روستائی سیدانی سے کیا خوش ہو سکتا تھا چند ہی سال کے اندر اکبر کا دل اس بی بی سے بھر گیا۔ الہ آباد میں امامیہ مذہب کے ایک متوسط الحال صاحب خوش سلیقہ میر امداد حسین نامی رہتے تھے۔ ان کے ایک جوان، خوش رُو اور خوش سلیقہ لڑکی فاطمہ صغریٰ تھی۔ اکبر کی نظرِ انتخاب اس پر پڑی۔ دوسری شادی کی خبریں سُن کر خدیجہ خاتون کے قصباتی اعزّا مارنے مرنے پر آمادہ ہوئے لیکن اکبر نے خدیجہ خاتون پر کچھ ایسا روغنِ قاز ملا کہ وہ خود ان کے دوسرے عقد پر راضی ہوگئیں۔ دوسری بیوی کے گھر میں آتے ہی سوکنوں کے جھگڑے شروع ہوئے اور اکبر کی ساری ذہانت و عدالت منہ دیکھتی رہ گئی۔ آخر نئی بیوی نے فتح پائی اکبر نے خدیجہ خاتون کو چالیس رُپے ماہوار حوالے کر کے اپنے سے ایسا علیحدہ کیا کہ پھر مدّت العمر ساتھ ہی نہ رکھا۔ خدیجہ خاتون سے دو لڑکے ہوئے۔ نذیر حسین عرف بدل میاں اور عابد حسین۔ نذیر حسین تو شادی کے پہلے ہی سال (۱۸۱۲ء) اس خاکدانِ حیات میں مصیبت جھیلنے کو تشریف لائے۔ اکبر نے سچ کہا تھا ؎

پیدا ہی نہ ہوتے کاش اطفال یہاں
یہ تو ناحق بلا ئے ہستی میں پڑے

بدل میاں لاولد رہے۔ عابد حسین کے ایک فرزند عاشق حسین ہوئے باپ اور تایا کی طرح نہ اُن کی ٹھکانے کی تعلیم ہوئی اور نہ تربیت، پیٹ کی مجبوری سے تنگ آکر نوعمری میں نوکری کو نکلے۔ پہلے کچھ دنوں

ریلوے کے دفتر میں کام کیا اس کے بعد ایک قلیل تنخواہ پر الہ آباد امپرومنٹ ٹرسٹ کے دفتر میں نوکر ہو گئے ؎

پھرتی ہے جس کو گردشِ دوراں لیے ہوئے
دل میں ہے وہ غریب کچھ ارماں لیے ہوئے

میں نے ان لوگوں کو سید اکبر حسین صاحب کے پاس آتے یا سید صاحب کو اُن کے ساتھ محبت کا اظہار کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ باہر تو باہر، خاص الہ آباد کے رہنے والے اکثر نہیں جانتے کہ یہ لوگ لسان العصر خان بہادر سید اکبر حسین صاحب جج کی اولاد ہیں۔ خدیجہ خاتون ان کو کلیجے سے لگائے تقریباً نصف صدی تک تنہائی کے دن کاٹتی رہی بقولِ اکبر ؎

تم بہتری کی فکر کرو بزمِ غیر میں
عزلت میں ہم تو اپنی تباہی کے ساتھ ہیں

نذیر حسین عرف بدل میاں گو جوان تھے لیکن افکار و امراض کے باعث بوڑھے معلوم ہوتے تھے۔ صورت پر پریشاں حالی برستی تھی۔ گلی چلتے مرگی کے دَورے سے گرتے تھے۔ راہ گیر ازراہِ خدا ترسی اٹھا لاتے تھے۔ دوا علاج بالائے طاق اُن کے پیٹ میں مہینوں چند چھٹانک گھی بھی نہ جاتا تھا جو دماغی و اعصابی ناتوانی کا کچھ بدل کر سکتا۔ اسی حالت میں وہ گورکنارے لگ گئے۔ جاں کنی کے وقت بیٹے نے باپ کو بہت یاد کیا اور خبر کرائی مگر خدا جانے دل میں کیسی گرہ پڑی تھی کہ نہ آئے اور اپنی اُکھڑی ہوئی سانسوں سے لڑنے والا منتظرِ دیدار فرزند ہمیشہ کے لیے قبر میں جا سویا۔ ایک دفعہ اکبر حسین بیمار پڑے

خدیجہ بیگم نے حالت خراب سُنی ہمت کر کے دیکھنے عشرت منزل آگئیں مگر حالات کی شدّت اور واقعات کی اہمیت نے جدا مجد کے خلد سے نکلنے کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ فاطمہ صغریٰ کے انتقال کے بعد بھی خدیجہ بی بی زندہ رہیں۔ ان کا انتقال ۱۹۲۰ء میں ہوا لیکن اس وقت بھی انھیں عشرت منزل میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔

عدو کی قسمت بگڑ بھی جائے ہماری قسمت وہی رہے گی (اکبر)

میں بعض واقعات سوچتا ہوں تو سخت متحیر ہوتا ہوں کہ جس خوش تمیز بی بی نے اکبر کے دل کو اپنی محبت اور قوتِ نفوذ کی ریشمی ڈوریوں سے اس طاقت سے باندھا تھا کہ زندگی تو زندگی مرنے کے بعد بھی اُس نے شوہر کو مرکز سے جنبش نہ کرنے دی وہ عقائد کے معاملے میں ان کو متزلزل کرنے میں کیوں ناکام رہی۔ جتنا زمانہ زیادہ گزرتا گیا اکبر حنفی عقائد میں نہایت متشدد ہوتے گئے۔ بعض بعض اوقات ان کا اہلِ تشیع کو مسلسل مرکزِ طعن و تشنیع بنائے رکھنا ناگواری کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔ اسی طرح خدیجہ خاتون کے ساتھ ان کا طرزِ عمل ان کے مخصوص احباب کو کسی طرح دل سے پسند نہ تھا۔ یہ لوگ کبھی کبھی منہ پر کہنے کی ہمّت کر جاتے تھے۔ مولانا محمد علی صاحب نامی پروفیسر میسور سنٹرل کالج نے ایک دن کہا سید صاحب، آپ پہلی بی بی سے اب اتنے کشیدہ ہیں، کبھی وہ آپ کی تنہا بی بی تھیں یا نہیں، اُن سے اولاد ہوئی یا نہیں، آپ اُن سے ملتے تھے یا نہیں۔ اس پر جواب دیا" اجی، بیت الخلا سے ملنے کا کیا ہے، یوں تو میں روزانہ چند منٹ کو پاخانے کے واسطے بھی قدمچوں پر ناک بند کر کے بیٹھا کرتا ہوں۔"

یہ دوسری بی بی فاطمہ صغریٰ (جو بعد میں اکبری بیگم کہلائیں) ایسی ملیں جن کو اکبر کا ذوق ایک زمانے سے تلاش کرتا تھا۔ ان کو اپنی تمام محویت و محبت کا محور گردانا، ان کی اسی سلیقہ مندی نے اکبر سے اعتراف کرالیا کہ

ہستی میری تھی ہی کیا بس ایک ورق سادہ ہے
رنگین نگا ہوں نے رنگین بنا ڈالی (جگر)

یہ گھر میں کیا آئیں لکشمی آئی۔ آئے دن دولت اور عزت میں اضافہ ہونے لگا۔ ان کے انتقال کے بعد ایک دن بچوں کی طرح آبدیدہ ہوکر کہنے لگے "عشرت منزل ان کے دم تک عشرت منزل تھی، اب نہ وہ سامانِ عیش ہے نہ احباب کا اجتماع، نہ دل کو اطمینان ہے نہ جسم کو راحت نا ہنجار نوکروں کے رحم وکرم پر مردہ بدست زندہ ہوں۔ ہائے

چل بسے اسباب راحت چشم عبرت رو چکی
میری ہستی تھی ہی کیا اور تھی جو کچھ وہ ہو چکی

پھر فرمایا

اب تک ہے انھیں حالتِ سابق کا تصوّر
یاروں نے میرا خانۂ ویراں نہیں دیکھا

فاطمہ صغریٰ سے عشرت حسین اور ہاشم دو اولادیں ہوئیں۔ عشرت حسین کو ولایت بھیجا، وہاں انھوں نے کئی سال صرف کر دیے۔ اس پر دل دوز نظمیں لکھیں اور جلد واپسی کی طرف متوجہ کیا کہ ع

کھا کے لندن کی ہوا عہدِ وفا بھول گئے

کیا اس کا انتظار ہے کہ ع

ماں خستہ حال ہو لے بے چارہ باپ مرلے

عشرت حسین صاحب واپس آئے، ڈپٹی کلکٹر ہوئے، اب پنشن لے لی ہے۔ عشرت حسین صاحب کی شادی شیخ احمد حسین صاحب رئیس پریانوان کی لڑکی سے ہوئی۔ نوّاب احمد حسین صاحب پہلے حنفی مذہب رکھتے تھے، انھوں نے شادی ایک شیعہ خاندان میں کی۔ تھوڑے عرصے بعد امامیہ مذہب اختیار کرلیا۔ اکبر حسین اس پر ان کو تو مومن سمدھی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ بعض لوگ دریافت کرتے ہیں کہ کیا عشرت حسین صاحب شیعہ ہیں؟ میں اُن سے کہہ دیتا ہوں کہ میرے علم میں نہیں ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں ایک اڈیٹر نے شایع کردیا تھا کہ عشرت حسین صاحب شیعہ ہیں۔ یہ سن کر سید عشرت حسین صاحب نے اپنے والد کو ایک خط انگریزی میں لکھا تھا۔ اس کا ترجمہ یہ ہے "میرے شیعہ ہونے کی خبر سے زیادہ کوئی خبر لغو مہمل اور غلط نہیں ہوسکتی۔ میں نے اقبال کو لکھا ہے کہ وہ پرچہ جس میں تم نے یہ خبر پڑھی مجھ کو روانہ کردو۔ اگر ایسی خبر دروغ چھپی ہے تو میں نہایت زور سے اس کی تردید شایع کروں گا اور میں اس کا تفحّص کروں گا کہ اس خبر کا مصنّف کون ہے؟ میں اس قسم کی بات کو دبا دبایا نہ چھوڑوں گا[1]" اصل یہ ہے کہ تیرے میرے عقیدے کا تجسس انھی لوگوں میں پایا جاتا ہے جو مذہب کو محض معاشرت سمجھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ فلاں شخص ہمارے گروہ میں آگیا۔ اکبر مرحوم نے سچ کہا ہے ؎

پہلے سنتے تھے صدائیں مردِ میداں کون ہے؟
اب تو یہ سرگوشیاں ہیں میری گوئیاں کون ہے

---

[1] ملاحظہ ہوں خطوط اکبر مطبوعہ خواجہ حسن نظامی صاحب

۲۔ کوچۂ حوروشاں

میں جب اکبر کے نحیف جسم اور غیر معمولی روشن دماغی پر غور کرتا ہوں تو دل میں کہتا ہوں کہ اگر یہ اپنی ذہنی اور جسمانی توانائی کے بہاؤ کو مختلف راستوں سے بچا کر ایک رُخ یعنی خدمتِ ادب کی طرف مرکوز کر دیتے تو کلیات کے علاوہ خدا جانے دنیا میں اور کیا کیا عجائبات چھوڑ جاتے۔ کہتے ہیں۔ ع

جوانی کیا تھی نیچر نے مجھے بیگار پکڑا تھا

کاش یہ تھوڑا سا بیگار کا زمانہ بھی بے کار نہ جاتا! مگر شاید قدرت اس زمانے کو بھی ایک حد تک باکار بنانا چاہتی تھی کہ اس نباض کے منہ سے جو کلمۂ حکمت نکلے وہ اس کے تجربے کی کسوٹی پر کسا ہوا ہو۔ بام خورشید رُخاں کا تجربہ خود اس دل دادۂ حسن کی زبان سے سُنیے ؎

بسر کیوں نہ ہو عشقِ خوباں میں اکبر　　خدا ہی نے دی ہے طبیعت کچھ ایسی

بتان خود فروش آخر فرستادند آں بل ہا　　طلب کردند زر چنداں کہ خوں افتاد در دل ہا

Bill

حاکمِ دل بن گئی ہیں یہ تھیٹر والیاں　　میں لگاؤں گا گلِ داغِ جگر کی ڈالیاں

ضبط کے جامے کے بخیے ٹوٹتے ہیں دوستو　　ہائے یہ بیلیں کشیدے اور لیسی جالیاں

فول کہتی ہیں وہ مجھ کو میں انھیں سمجھا ہوں پھول　　ہیں گلِ نرگس سے بہتر ان گلوں کی گالیاں

Fool

بھائی مجھے بات کل یہ بھی سُنی کی　　تفریق اٹھا دو شیعہ و سُنی کی

کون آرام سے دنیا میں ہے گو ہر کے سوا　　سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

ہرج کیا ہم بھی جو چشمِ سرگیں پر پِس لیے   یہ بلائیں اس تماشا گاہ میں تھیں کس لیے

ہمارے دم سے تابندہ بُتوں کے بالے بُندے ہیں
ہمیں نے ان کو چمکایا ہمیں دوزخ کے کُندے ہیں

مجھ میں اظہارِ محبت اُن میں اظہارِ کمال   میں وہاں روتے گیا اور وہ کہیں گانے گئے

حسینوں کے ارتباط کے بارے میں خواجہ حسن نظامی صاحب کا ایک دل چسپ نظریہ نظر سے گزرا، وہ بھی سن لینے کے قابل ہے۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں "جب عورت میں فلم ایکٹرس کی خوبیاں دکھائی نہیں دیتیں تو مرد محض تفریح کے لیے بازاری عورتوں کے پاس جاتے ہیں صرف اس نیت سے کہ تفریح سے دل ودماغ میں قوت بڑھے گی اور بیوی بچوں کے لیے زیادہ محنت کے ساتھ روزی کمائی جا سکے گی"

میرے خیال میں یہ طنز حقیقت سے بالکل بیگانہ نہیں۔ یہ بات کچھ اُس زمانے کے فیشن میں داخل تھی کہ لوگ خوش رو اور خوش گلو ہستیوں کو سامانِ راحت وامارت سمجھ کر ساتھ رکھتے تھے۔ اکبر کی طبیعت کی جودت کا عجیب حال تھا، نچلا بیٹھنا نہ جانتی تھی۔ یہ اس سے خود تنگ تھے۔ فرماتے ہیں ؎

کان میں بات بزرگوں کی سماتی ہی نہیں
ناک میں دم ہے جوانی کے خریداروں سے

میرے دوست مولوی شیخ ارشاد حسین صاحب وکیل حیدرآباد نے ایسے عاشقانہ جنون کا اچھا فوٹو کھینچا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

گلے کا طوق کرتا ہوں کبھی گھونگر بناتا ہوں
مری دیوانگی ہے اور ان کی زلفِ پیچاں ہے

الہ آباد میں حمام والی طوائف "چوہا" مثنوی میر حسن عجیب موثر انداز سے گاتی تھی۔ اکبر اس کے آرٹ کے دل سے قائل تھے۔ اس کے لے پالک "اسلام" کی آواز بھی بلا کی دل دوز تھی۔ اکبر نے اس کو بھی اپنی متعدد غزلیں یاد کرنے کو دی تھیں۔ وکالت کا شکرانہ مجروں کے لیے وقف تھا۔ اس کے خازن و مہتمم ان کے بچپن کے رفیق چھدی میاں تھے چند سن چلوں کی جماعت لگا رکھی تھی کہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔ مثلاً کموا نائی، قادر کن میلیا، بھتن کہار، کھجو دلال۔ ایک مقامی برہمن اور ہندو ملازم۔ اکبر ان صحبتوں میں شریک رہے مگر ہمیشہ اپنے کو لیے دیے۔

ڈر یہ تھا بات کہیں ہاتھ سے جاتی نہ رہے
آبرو ان کی ملاقات سے جاتی نہ رہے (شرر بدایونی)

خود فرماتے ہیں ؎

عیّاش ہوں قلتبان نہیں ہوں

اس زمانے میں (۱۸۸۰ء) یہ ہائی کورٹ میں مسل خواں تھے ٹائرل صاحب جج تھے۔ ان کو کسی نے یہ خبریں پہنچا دیں۔ انھوں نے بلا کر سمجھایا "اکبر! یہ مشاغل تمھاری شان کے خلاف ہیں اور تمھاری ترقی میں حائل ہیں۔ بہتر ہے کہ ان صحبتوں کو ترک کر دو بات سمجھ میں آگئی" "نیٹو کی کیا سند ہے صاحب کہیں تو مانوں"۔ اس دن سے بتانِ خود فروش سے آزادانہ روابط کم کر دیے۔ مگر ؎

رُکتے رُکتے رکیں گے آنسو رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

کبھی کبھی امامن جانکی بائی اور چہ ہا کا گانا تخلیے میں سنتے رہے، امامن کو بھی اپنی متعدد غزلیں یاد کرائی تھیں۔ ۱۸۶۷ء میں میر سجاد حسین کے یہاں اُن کے لڑکے سمیع اللہ کے پیدا ہونے کی تقریب میں جلسہ تھا۔ اکبر نے اپنی غزل ؎

جو اُس سرو قد سے جدائی ہوئی ہے
قیامت مرے سر پہ آئی ہوئی ہے

امامن کو دی۔ اُس نے وہ اسی جلسے میں گائی۔ کلیاتِ اکبر حصّۂ اوّل میں یہ غزل چھپ گئی ہے لیکن امامن کو دیے ہوئے اشعار میں ایک یہ شعر زیادہ ہے۔ غ

ہمیں نے ابھارے ہیں جوبن تمہارے
ہماری یہ آفت اٹھائی ہوئی ہے

اسی طرح اس غزل میں ؎

تمھی سے ہوئی مجھ کو الفت کچھ ایسی
نہ تھی ورنہ میری طبیعت کچھ ایسی

اس کے پاس یہ شعر بھی نیا ہے۔ غ

بتوں نے شرف تیرے جلوے سے پایا
نہ تھی ورنہ اُن کی حقیقت کچھ ایسی

نیز اس کے پاس کی اس غزل میں ؎

تری زلفوں میں دل الجھا ہوا ہے
بلا کے پیچ میں آیا ہوا ہے

یہ شعر بھی نیا ہے۔ غ

صفائی تیرے عارض کی ہے ایسی　　کہ آئینے کو بھی سکتہ ہوا ہے

امامن کے قدردانوں میں ایک مسلمان ڈپٹی بھی تھے۔ وہ اکبر کے اثر کو توڑتے رہتے تھے۔ آخر میں بدمزگی زیادہ ہوگئی تو انھوں نے اپنے عہدے اور اثر سے کام لے کر الہ آباد سے اکبر کا تبادلہ کرا دیا۔ مشہور ہے کہ:۔ "شاعر چو رنجد بگوید ہجا" اکبر نے اپنے جلے دل کے پھپھولے یوں پھوڑے۔ غ

عزیزوں کی محبت ہمنشیں کی یاد سے چھوٹے

امامن کی ادا ہائے ستم ایجاد سے چھوٹے

. . . . کی ایک دخترِ نوزاد سے چھوٹے

میاں کھجّو کی فرمایش سے اور ارشاد سے چھوٹے

الہ آباد ہم سے ہم الہ آباد سے چھوٹے

جوانی کی ہوا سے کون محفوظ رہا ہے۔ اکبر کو بھی یہ ہوا کچھ لگی۔ لیکن توفیقِ رب نے عدو کو سببِ خیر بنا دیا اور یہ طوفانی جوانی کے زمانے میں اس غرق کرنے والے ماحول سے صاف نکل گئے ع

ما خدا داریم ما را نا خدا در کار نیست

۳۔ مشقِ سخن اور شاعری کے جلسے

اکبر موزوں طبیعت ابتدا ہی سے تھے۔ ذوقِ فطری چھیڑتا تھا تو اشعار کہتے تھے۔ ابتداءً ورڈسورتھ کی طرح فطرت ہی کو اپنا استاد بنایا۔ لیکن بعد کو جو روگی کو بھایا وہی بید نے بتایا۔ استاد بھی ملا تو اپنے ہی جیسا شوریدہ سر اور وارفتہ مزاج۔ میری مراد وحید میاں سے ہے۔ وحید میاں مولوی امیر اللہ صاحب وکیل کے بیٹے تھے۔ کٹرے

کے رہنے والے تھے۔ شاعری میں آتش سے استفادہ کیا تھا۔ والد کی وکالت کے سلسلے میں الہ آباد میں قیام رہتا تھا۔ الہ آباد کی کوئی حسین اور خوش گلو، طوائف ایسی نہ تھی جس کے یہاں نہ جاتے ہوں۔ بلا کے حسن دوست تھے لیکن بدکاری سے کوسوں دور۔ امامن، نصیبن اور ببّن کے ہاں زیادہ جاتے تھے۔ ۲۵ سال کے سن میں پندرہ سالہ اکبر کو ساتھ لیے ہوئے ہاتھ کی ایک انگلی کا ناخون دانتوں میں چباتے ہوئے ببّن کے کوٹھے پر چلے جا رہے ہیں۔ کہا: کیا کر رہی ہو، ذرا ادھر تو آؤ، کچھ اشعار کہہ لیں۔ وہ زیرِ لب تبسم کے ساتھ ناز سے آئی۔ مضامین کی بارش شروع ہوئی۔ چند اشعار لکھے اور شکریہ ادا کرتے ہوئے نیچے اتر گئے۔ ایک دن نصیبن کے یہاں پہنچے، وہ خربوزہ کاٹ رہی تھی۔ اس منظر نے ہی ایک شعر دے دیا، وہیں فرمایا ؎

مصروف ہیں جو آپ بنانے میں قاش کے
رکھ لیجیے گا دل بھی ہمارا تراش کے

وحید میاں نہایت بلند شعر کہتے تھے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار پیش کرتا ہوں ؎

اقبال نے دوستی نباہی ۔۔۔ منہ دیکھ کے رہ گئی تباہی

مغفرت یوں پوچھنی ہے حشر میں مجھ سے وحید
وہ فدائے نامِ پاکِ پنجتن کیا ہو گیا
شمع کے گل ہوتے ہی پروانے سب رخصت ہوئے
دفعتاً کیا تھا سیانِ انجمن کیا ہو گیا

اس دل کی ہو بہار و خزاں اُن کے ہاتھ میں
گلشن بنا دیا کبھی ویرانہ کر دیا

مجھے یہاں وحید میاں کے کلام کو بالتفصیل پیش کرنا مقصود نہیں ہے۔ جن صاحبوں کو مطلوب ہو وہ انجمن ترقی اُردو کو لکھیں۔ وہاں سے مرحوم کا کلام شایع کیا جا چکا ہے۔ ان کا بیشتر کلام تو آگ کی نذر ہو گیا۔ خود ان کی جان بھی اسی میں گئی۔ جس کمرے میں دیوان رکھا تھا اس میں آگ لگی دیکھتے ہی" ارے میرا دیوان، ارے میرا دیوان" کہتے ہوئے اندر گھس گئے۔ اختلاج کے مریض، دُھنوئیں سے دم گھٹ کر بے ہوش ہو گئے۔ باہر نکالے گئے تو جسم سے جان مفارقت کر چکی تھی۔ دیکھتے دیکھتے ایک تیس سالہ ہونہار شاعر دنیا میں اپنی جگہ خالی کر گیا۔ افسوس۔ ع

دفعتاً کیا تھا میانِ انجمن کیا ہو گیا

زندگی میں اکبر کو وحید میاں کا تھوڑا فراق بھی گوارا نہ تھا، شکوہ کرتے رہتے تھے ؎

وحید صبحِ بنارس کی موج میں ہیں پڑے
بھلا وہ کرنے لگے کیوں اودھ کی شام قبول

اس شفیق کے انتقال کے بعد اکبر کا شاعری میں کوئی رہبر نہ رہا۔ زمانے کی رفتار کو دیکھتے ہوئے سمجھ لیا کہ اب تغزل میں چمکنا کوہ کندن و کاہ برآوردن ہے۔ لہٰذا اس جادہ سے مڑ کر تفنّنِ سیاست اور تصوّف کی راہ پر پڑ لیے۔ تفنّن کے لیے مغربی تمدن کا ایسا نیا میدان ڈھونڈا کہ اس کے موجد بھی ہوئے اور خاتم بھی۔ اقلیم شاعری میں یہ زمین ایسی اپنالی کہ شفعہ کا دعوے دار حقیقی اب تک پیدا نہ ہوا۔ اور تو اور خود ڈاکٹر اقبال نے تقلید کی کوشش

کی مثلاً ؎

ممبری امپیریل کونسل کی کچھ مشکل نہیں
ووٹ تو مل جائیں گے پیسے بھی دلوائیں گے کیا

مگر بقولِ اکبر مرحوم ؎

ہمارا شیخ جی کا کیا بھلا جوڑ کجا کھبوٹ کجا دیوان حافظ

صاف معلوم ہوگیا کہ یہ کامیاب نقل نہیں ہے۔ آخر یہ رنگ چھوڑنا پڑا۔ اکبر نے پہلے ہی پیشین گوئی کردی تھی ؎

مری طرزِ فغاں کی بوالہوس تقلید کرتے ہیں
خجل ہوں گے اثر کی بھی اگر امید کرتے ہیں

ایک دن میرے وطن بدایوں سے ایک صاحب نے مجھے الہ آباد ایک خط بھیجا اس میں یہ اشعار لکھے ؎

میلی سی شیروانی ہے بوسیدہ پینٹ ہے چہرے پہ پاؤڈر ہے نہ پاکٹ میں سینٹ ہے
سرکار اس کو خان بہادر کہا کرے ہم تو یہی کہیں گے کہ انسالوینٹ ہے

اور دریافت کیا کہ یہ اشعار اکبر حسین صاحب کے ہیں، یہاں بدایوں میں مشہور ہے کہ اکبر نے کہے ہیں اور فلاں صاحب پر چوٹ کی ہے۔ میں نے عشرت منزل جاکر دریافت کیا۔ بولے، استغفر اللہ میں ان صاحب کو جانتا بھی نہیں۔ میں تو دنیا کی غلط بحثوں سے بے حد تنگ آگیا ہوں۔ دنیا میں کوئی بھی گوز لگائے، خوش عقیدہ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ یہ بھی منجانب اکبر حسین ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کے بھی تمام اشعار میں عطر و عنبر کی بو نہیں آتی۔ چاروں مصرعے کسی کے بھی ہوں ایسے بدبودار تو نہیں ہیں جیسی آپ ناک بھوں چڑھاتے ہیں "درستِ گبر آئینہ کافر

نمی شود" (بیدل) فرمایا: اجی۔ ع

نہ ہر کہ ہیٹ پوشید مسٹری داند

وحید میاں جب تک حیات رہے مقامی شاعری کے جلسوں کی زندگی بنے رہے۔ الہ آباد میں اُس زمانے میں چار اصحاب اپنے اپنے مکانات شعر و سخن کے جلسوں کے مراکز بنائے ہوئے تھے۔ مولوی غلام غوث صاحب میر منشی دفتر گورنر، میر سجاد علی صاحب راجا پوری وکیل ہائی کورٹ، دائرہ شاہ اجمل کے ایک مرشد شاہ امین صاحب قیصر اور سید عابد علی صاحب بی۔اے، ایل۔ایل۔بی۔ اکبر کی نوعمری میں فارسی کا اچھا چرچا تھا۔ ایک دن کچھ احباب منشی غلام غوث صاحب کے پاس جمع تھے۔ خاقانی کے اس شعر کی داد دی جارہی تھی ؎

اے بت من تو قدر دل بشناس

مالکِ خانۂ خدا شدۂ

رائے یہ قرار پائی کہ اس زمین میں وہیں اسی وقت طبع آزمائی کی جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد مولوی غلام غوث صاحب نے اپنا مطلع سنایا۔

آفت گبر و پارسا شدۂ

چشم بد دُور خوش ادا شدۂ

لوگوں نے بہت داد دی۔ لیکن جب سید اکبر حسین صاحب نے اپنا یہ عارفانہ مطلع سنایا۔ ع

اے کہ ہر درد را دوا شدۂ

نمکِ زخمِ من چرا شدۂ

تو لوگ جھومنے لگے۔ بڑی تعریفیں ہوئیں۔ دوسرے لوگوں کی ہمتیں پست ہوگئیں۔

پھر اس کے بعد اس زمین میں کچھ نہ کہہ سکے۔ سید عابد علی صاحب کے مکان نے تو آخر میں ایک مستقل علمی کلب کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ذو القدر صاحب ڈپٹی، مولوی خلیل الدین صاحب طبیب، الطاف حسین صاحب جون پوری، مولوی فرید الدین صاحب وکیل، مولوی بدیع الزماں صاحب زمیندار، شہزادہ قیصر بخت صاحب، مولوی عزیز الدین صاحب اخگر جیسے ہم مشرب جمع ہو گئے تھے۔ شاہ امین الدین صاحب قیصر اور مولوی عزیز الدین اخگر کی آپس میں رقیبانہ چشمک چلتی رہتی تھی۔ اکبر اخگر کے طرفدار تھے اور ان کی دوستی میں دائرے کے اس مرکز ارشاد و تصوف قیصر پر چھپ چھپ کر طعن و تشنیع کے تفنچے چلاتے رہتے تھے۔ ایک دن سید عابد علی صاحب کے مکان میں مشاعرہ ہوا۔ مصرع طرح تھا۔ ع

چھت جو گرتی ہے تو شہتیر الٹ جاتا ہے

اکبر نے اخگر کی خاطر ایک غزل لکھ کر ہوٹل کے ایک ملازم کموا نائی کو پڑھنے کو دے دی۔ اس شعر میں شاہ امین الدین صاحب پر چوٹ تھی ؎

شب کو تنہائی میں پڑھتا ہے نماز معکوس
صبح ہوتی ہے تو ایک پیر الٹ جاتا ہے

قیصر سن کر سوخت ہو گئے۔ تہذیب و متانت کا پارہ غصّے کی گرمی سے جنون کے معیار تک چڑھ گیا۔ وہیں مشاعرے میں دو عریاں شعر لکھ کر اپنے ایک شاگرد احمد شاہ کو دیے۔ انھوں نے کموا اور اخگر سے مخاطب ہو کر دلیری کے ساتھ پڑھ دیے ؎

جب مسالا نہیں پاتا ہے کموا نائی — دیگ میں ڈال کے کفگیر الٹ جاتا ہے
ای شرابی تیری غیرت پہ ہزاروں افسوس — غیر آ کر تیری ہم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الٹ جاتا ہے

پانی اسی طرف بہا جدھر نشیب تھا۔ انگر سنتے ہی آگ ہو گئے ضبط نہ ہو سکا "پھر تو پڑھ" کہتے ہوئے آستینیں چڑھا کر بڑھے۔ اب کیا تھا ہشت مشت شروع ہو گئی۔ بزم مشاعرہ جائے مجادلہ بن گئی۔ یہ ہنگامہ دیکھا تو اکبر گھر کی طرف لپکے۔ بقول بیڈھب شاہجہاں پوری ؎

اٹھے جو مارنے کو وہ ہنٹر لیے ہوئے
بھاگے وہاں سے ہم دلِ مضطر لیے ہوئے

یا بقول ریاض خیر آبادی ؎

چھیڑ کر مجمعِ زہّاد کو ڈرتا ہوں ریاض
کہنہ مسجد کی طرح ہو نہ مرمّت میری

اس ہنگامے نے اتنا اثر ضرور کیا کہ اکبر نے آیندہ شاہ صاحب کو چھیڑنے سے کان پکڑ لیے۔ آخر عمر میں انقلاب زمانہ کی ہوا اور پیری کی نقصانے اوراقِ عافیت کو سخت پریشان کر دیا تھا۔ عام صحبتوں اور مشاعروں کی شرکت سے بہت گھبرانے لگے تھے۔ گاہے ماہے شریکِ مشاعرہ ہوتے تھے وہ بھی زیادہ تر میر سجاد علی صاحب کے یہاں راجا پور کے مشاعروں میں۔ ۱۹۲۱ء میں مرض الموت میں مبتلا تھے۔ میر سجاد علی صاحب نے دعوت نامہ بھیجا اس کے ساتھ رسادل بھی روانہ کی۔ بوجہ علالت شریکِ مشاعرہ نہ ہو سکے۔ طرح میں غزل روانہ کر دی جس کا مطلع یہ تھا۔ غ ؎

ہو بیاں کیوں کر عنایت حضرتِ سجاد کی
لذتیں لوں گا میں آردِ رسادل زاد کی

تلاشِ معاش و ترقی

انسان خواہ کیسا ہی سعی کو سراہے اور خود کو مختار سمجھے لیکن غور سے دیکھیے تو یہی

نظر آتا ہی کہ "سر اسر بستہ بہ قسمت است"۔ ہوا و حوادث اس کو جس طرف لے جاتے ہیں، جاتا ہی۔ عرفیؔ نے کیا خوب کہا ہو ؎

چنداں کہ دست و پا زدم آشفتہ تر شدم
ساکن شدم میانۂ دریا کنار شد

سچ پوچھیے تو حوالگی مشکل ہو۔ یہ ہو جائے تو خود لہریں کنارے لگا دیتی ہیں۔ اکبرؔ کی زندگی اس اجمال کی تفصیل ہو۔ دیکھیے معاشی زندگی کہاں سے شروع ہوتی ہو اور حالات کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ خود کہتے ہیں ؎

مجھے تو اپنی ترقی میں غور کچھ بھی نہیں
خدا کے نام کی برکت ہو اور کچھ بھی نہیں

گھر پر ابتدائی تعلیم جو کچھ ہوئی وہ معمولی مشرقی۔ اور ظاہر ہو کہ جب کوئی مرؤجہ اسنادی علم نہ حاصل کیا ہو تو بڑی نوکری کیسے ملے۔ پندرہ برس کی عمر میں گلے میں سنتِ پیغمبری کا طوق پڑ چکا تھا۔ بے روزگاری میں یہ بوجھ اور سببِ کاہشِ جان تھا۔ دو برس تک کوشش کرتے رہے لیکن کہیں چار پیسے کا سہارا نظر نہ آیا اور پریشانیاں بڑھتی رہیں۔ خود فرماتے ہیں ؎

کچہریوں میں ہی پرسش گریجو یٹوں کی — سڑک پہ مانگ ہو قلیوں کی اور ٹٹوں کی
نہیں ہو قدر تو کچھ علم دین و تقوے کی — خرابی ہو تو فقط شیخ جی کے بیٹوں کی

سید بننا ہو تو بنو سر سید — ہونا ہو خاں تو تم ہو انگریزی خواں

لطف چاہو اک بتِ نو خیز کو راضی کرو — نوکری چاہو کسی انگریز کو راضی کرو

انگریز دانی کے لیے انگریزی دانی کی ضرورت تھی۔ اکبر اس زمانے میں "چار دؤنی آٹھ"[1] سے تو آگاہ تھے لیکن فاکس معنی لومڑی کی دم سے بھی واقف نہ تھے۔ ایسے آڑے وقت میں لومڑی کی نہ سہی دمڑی کی واقفیت نے کچھ کام نکالا۔ الہ آباد میں ۱۸۶۳ء میں جمنا کا پل بن رہا تھا۔ ٹھیکے دار کو ایسے منشی کی ضرورت تھی جو اینٹیں ڈھونے والے مزدوروں کو کوڑیوں کی شرح سے حساب کر کے روزانہ پیسے تقسیم کر دیا کرے۔ اس عہدۂ جلیلہ کے لیے قرعۂ فال اکبر کے نام پڑا۔ پندرہ روپے ماہوار کی صورت نظر آئی۔ لیکن ظاہر ہی جمنا کا پل ساری عمر تو بنتا نہ رہتا۔ تھوڑے عرصے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا تو ریلوے کی طرف رخ کیا۔ ۱۸۶۶ء تک ریلوے کلرک رہے اس زمانے سے خانگی طور پر انگریزی سیکھنے کی طرف توجہ کی۔ ۱۸۶۷ء میں وکالت درجۂ سوم کا امتحان دیا، کام یاب ہو گئے۔ کچھ دن پریکٹس کی۔ ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیلداری کی ایک عارضی خدمت ہاتھ آ گئی۔ چند ماہ بعد داروغہ آبکاری ہو گئے۔ اس سلسلے کے اختتام پر ہائی کورٹ میں مسل خوانی کی جگہ مل گئی۔ اس پر تین برس تک جم کر کام کیا۔ یہاں انگریزی کی مشق کے ساتھ مزید قانون کی تیاری میں مصروف رہے۔ ۱۸۷۳ء میں ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کر لیا اور پریکٹس کرنے لگے۔ تھوڑے عرصے بعد منصفی میں منتخب ہو کر ہاتھرس چلے گئے۔ یہاں حکّام اور پبلک کے دل میں اپنی کاردانی اور لیاقت کا اچھا سکّہ بٹھایا کہ ایک ایک دن میں انتیس انتیس مقدّمے فیصل کیے۔ گورمنٹ نے قابلیّت کا اعتراف کیا اور سب ججی کے واسطے منتخب کر لیے گئے۔ سب ججی کے زمانے میں رستم جی نامی

---

[1] کالج و اسکول کی بجتی ہے ہر سو تومڑی   چار دؤنی آٹھ ہیں اور فاکس معنی لومڑی

ایک پارسی ڈسٹرکٹ جج تھے۔ اسی زمانے کا یہ شعر ہے ؎

عکس سب جج دب گیا تصویرِ جج کے سامنے
اکبری دربار رستم کا اکھاڑا ہو گیا

سب ججی سے ججی کی کرسی پر پہنچے اور اضلاع سے گھوم گھام کر پھر الہ آباد آ گئے۔ جب تک علی گڑھ میں رہے، سر سید سے خوب نوک جھوک رہی۔ اُن کے علم و خلوص کی دل سے قدر کرتے تھے مگر یہ یقین رکھتے تھے کہ مسلمان جس تیزی کے ساتھ یورپین تہذیب سے متعارف کرائے جا رہے ہیں وہ شدّت سے اپنا مضر رنگ لائے بغیر نہ رہے گی اور مسلمان بالآخر دین سے بیگانہ ہو جائیں گے۔ فرماتے ہیں ؎

نماز بے وضو سے رو رہی ہے اک طرف مسجد — اُدھر قرآن بے رغبت سے دل مذہب کا سیپارہ

سراسر نورِ ایماں سایہ پر قربان کر آئے — یہ کیا اچھا کیا تم نے اگر زر کھو کے مس لائے

کہا کسی نے یہ سیّد سے آپ اے حضرت — نہ پیر کو نہ کسی پیشوا کو مانتے ہیں
جواب اُنھوں نے دیا ہم ہیں پیروِ قرآن — ادب ہر اک کا ہے لیکن خدا کو مانتے ہیں
جوابِ حضرتِ سید کا خوب ہے اکبر — ہم اُن کے قول درست و بجا کو مانتے ہیں
و لیکن اس نئی تہذیب کے بزرگ اکثر — خدا کو اور نہ طریقِ دعا کو مانتے ہیں
زبانی کہتے ہیں سب کچھ مگر حقیقت میں — وہ صرف قوّتِ فرمانروا کو مانتے ہیں

سر سیّد سے صاف کہہ دیا تھا ؎

مغربی پارک ہیں چکر کے سوا کچھ بھی نہیں
دلِ رنگیں کی ہوا کھاؤ بڑی سیر یہ ہے

ہر گام پر جو طاعتِ حق سے الگ پڑا ۔۔۔ ہوتے رہو گے مرکزِ قومی سے تم بعید

بٹھائی جائیں گی پردے میں بیبیاں کب تک ۔۔۔ بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کب تک

غرض کہ سر سید کی اس آزاد خیالی میں ان سے کبھی متفق نہ ہوسے ۔
دیکھیے ان حالات میں ان سے اختلاف کی داستان ان چار مصرعوں
میں کس بلاغت سے بیان کی ہی ؎

حاضر ہوا میں خدمتِ سیّد میں ایک رات ۔۔۔ افسوس ہی کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات
بولے کہ تجھ پہ دین کی اصلاح فرض ہی ۔۔۔ میں چل دیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہی

یہ بھی کسی طرح گوارا نہ تھا کہ تنگ خیال مولوی صاحبان سر سید کو کافر
کہیں ۔ کہتے تھے کہ سر سید کی نیک نیتی اور ایثار کے صلے میں خدا تو انھیں
جنت دے مگر خُلد کے ٹھیکے دار مولوی انھیں جنت میں نہ آنے دیں ؎

مولوی صاحب نہ بخشیں گے خدا گو بخش دے
گھیر ہی لیں گے پولس والے سزا ہو یا نہ ہو

جب مر کے چلے ہیں سوے جنت سیّد ۔۔۔ لٹھ لے کے امام ابو حنیفہ دوڑے

الہ آباد کی سشن ججی کے زمانے میں اعلیٰ قسم کی اخلاقی جرأت کا ثبوت دے کر
ایک مقدمے کا فیصلہ کیا ۔ حبیب اللہ صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ
پولیس رشوت ستانی میں ماخوذ ہو گئے تھے ۔ مقامی فضا ان کے سخت
خلاف تھی ۔ سیّد اکبر حسین صاحب نے ان کو صاف بَری کر دیا ۔ وطن میں
بے لاگ کام کرنا نہایت دشوار تھا لیکن انھوں نے سفارشوں کو
بالائے طاق رکھ کر انصاف کر کے بتا دیا ۔ ایک دن قادر کان سیلیا

یعنی اُن گلیوں کا ساتھی جن میں جوانی کھوئی تھی، ایک مقدّمے میں سفارش کے واسطے پہنچ گیا۔ پوچھا، سچ بتاؤ اس میں تم کو کتنا ملے گا۔ اس نے کہا دس رُپے۔ ایک دس رُپے کا نوٹ جیب سے نکال کر دیا اور کہا یہ لے جاؤ، اب سفارش سے سروکار نہ رکھو۔ وہ راضی ہو گیا۔ احباب کے ذریعے صحیح رہبری ہو جاتی تھی تو تجویز بدل بھی دیتے تھے۔ یہ جب کانپور میں صدرِ اعلیٰ تھے تو حمیدی میاں ایک ہندو بزّاز کی سفارش کو پہنچ گئے تجویز بزّاز کے خلاف لکھ چکے تھے۔ اصل حالات سے باخبر ہونے کے بعد تجویز چاک کرا دی اور بزّاز کی موافقت میں از سرِ نو تحریر کی۔ سشن ججی سے ہائی کورٹ کی ججی کے واسطے بھی نام زبانوں پر آنے لگا تھا لیکن اس کرسی تک پہنچنے کا موقع نہ آیا کہ ۱۹۰۵ء میں پنشن کا وقت آگیا اور اپنے مستقل عہدۂ ججی خفیفہ الہ آباد سے پنشن پر سبکدوش ہو گئے۔ ۱۹۰۸ء میں گورمنٹ نے جوڈیشل خدمات کے صلے میں خان بہادری کا خطاب عطا کیا۔ اسی سال الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی منتخب ہوئے۔ پنشن کے بعد پورے پانچ سال بھی اطمینان کی زندگی نہ گزار سکے تھے کہ غیب سے سنگ آمد و سخت آمد۔ اور یہ پتھر بھی کہاں لگا، سب سے زیادہ دُکھتی رگ پر۔ ۱۹۱۰ء میں عشرت حسین کی والدہ پنجۂ قضا کی گرفت میں آگئیں۔ اکبر کے خانۂ دل میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ اس چوٹ کے احساس نے چار مصرعے کیسے آئینہ دارِ حقیقت لکھوا لیے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

آمادہ حریف ہیں ستانے کے لیے ۔۔۔ اور دُکھ میں شریک ہونے والا نہ رہا
زندہ ہوں تو مجھ پہ ہنسنے والے ہیں بہت ۔۔۔ مر جاؤں تو کوئی رونے والا نہ رہا

دیگر

الحذر اس درد سے جو مشتقل ہوکر رہے
الاماں اس یاد سے جو زخمِ دل ہوکر رہے

اس صدمے نے قلب کو ایسا مجروح کیا کہ دو برس بعد تک گھاؤ کی یہ حالت تھی " میرا دل خون ہے لیکن آسمان دامنِ یار کو اسی خون کی گوٹ سے زینت دینا چاہتا ہے تو کیا چارہ ہے۔" (خط مورخہ ۳ر مارچ ۱۹۱۲ء بنام خواجہ حسن نظامی صاحب) میرے ماموں تولا حسین صاحب کا شعر ہے ؎

ہو عمر زیادہ ترے سامانِ ستم کی کچھ تیر ہیں چٹکی میں جو ہم یاد ہوئے ہیں
(تولاؔ)

اکبر حسین جس آسمان کی خط میں شکایت کرتے ہیں اس نے جون ۱۹۱۳ء میں انھیں پھر یاد کرکے ایک تیر اور سر کیا۔ اس مرتبہ مجروح دل کا پھایا چاردہ سالہ ہاشم قبر میں اُتارا گیا ؎

میں تیرے ہاتھوں کے قرباں واہ کیا مارے ہیں تیر
سب دہانِ زخم تجھ کو مرحبا کہنے کو ہیں

اس آخری خدنگِ بلا نے اکبر کی نظر کا زاویہ بالکل سیدھا کر دیا۔ خواجہ صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔" سینے میں الجھن، دماغ میں گرمی محسوس ہوتی ہے۔ بہت کم روتا ہوں لیکن دل ہر وقت بھرا ہوا اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی رہتی ہیں، کوشش کرتا ہوں کہ ہاشم کے بدلے ہاشم آفریں کا تصور کرکے اس سے فریاد کروں اور مدد چاہوں لیکن وہ بھولی صورت اور پیاری آواز چشم و گوش پر

ہنوز محیط ہی۔ پھر اس بچّے کے ارمان، اس کی بے بسی، اس کا اللہ اللہ کرتے رہنا، نازوں کو چھوڑ کر اس چودھویں سال کی عمر میں بے کسانہ اور عاجزانہ فریاد پر آجانا، معاذاللہ ان باتوں کی یاد دل پر بجلیاں گراتی ہی وہ لڑکا میری طبیعت کے سانچے میں ڈھل رہا تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتا ہوں۔ افسوس ہی کہ اس کے معانی پر پیش تر سے غور کرکے ان حوادث کے لیے تیار نہ تھا۔ اِنّاللہ کا مطلب یہ ہی کہ میں بھی خدا کے لیے اور لڑکا بھی خدا کے لیے۔ میں سمجھتا تھا کہ لڑکا میرے لیے ہی۔"

اکبر کے حسبِ حال میرا ایک شعر ہی ؎

اب وہ سمجھا جس کو پہلے ہونٹوں سے بظاہر کہتا تھا
میں اس افتاد سے پہلے بھی اللہ کو قادر کہتا تھا

آخر میں اکبر خود اس راز سے باخبر ہو کر کہتے ہیں ؎

حُسنِ آغاز تو رکھتا ہی یہ عیشِ دنیا   مگر افسوس یہ ہی خوبیٔ انجام نہیں

آغاز یہ تھا کہ دل بڑھا تھا   جو بت تھا نگاہ پر چڑھا تھا
انجام یہ ہی کہ مر رہے ہیں   اللہ اللہ کر رہے ہیں

اب تو ہی یہ سوچ کیا ہیں کیا نشاطِ زندگی
ہو چکا وہ دن کا دورِ انبساطِ زندگی
دیکھیے انجام کیا ہو ڈر رہا ہوں سوچ کر
لذّتِ دنیا سے ایسا اختلاطِ زندگی

پھر فرماتے ہیں ؎

سنورتے تھے کہ ایک عالم کی نظریں ہم کو دیکھیں گی
خبر کیا تھی ہماری مجلس ماتم کو دیکھیں گی

جب اپنے آپ حقیقت سے مطلع ہوگئے تو دوسروں کو بھی آگاہ کرتے ہیں ؎

داستانِ غم نہ حالاتِ الم کو دیکھیے
آپ کو آنسو بہانا ہیں تو ہم کو دیکھیے

باب دوم

مجھ سے مراسم اور خطوط

"میں ہوں دیوانہ مجھے انس ہے دیوانوں سے"

مجھے بچپن ہی سے دواوین دیکھنے اور اشعار سننے کا شوق رہا ہے۔ سید اکبر حسین صاحب کے اشعار دیکھتا تھا تو دل میں بے اختیار اُن سے ملنے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ دماغ اُن کی صورت، حیثیت، فیشن اور جسامت وغیرہ کے خیالی نقشے تیار کرتا رہتا تھا۔ جب ۱۹۱۶ء میں الہ آباد کے ایم سی کالج میں داخلے کے واسطے آیا تو یہ اشتیاقِ دیدار پورا ہوا۔ ایک صحبت میں خان بہادر میر اکبر حسین صاحب جج الہ آبادی کے درشن ہوئے مگر ایسے کہ ع

آنکھیں اپنی باقی اُن کا

کسی کے متعلق کسی کا قیاسی خاکہ شاید ہی ایسا غلط ثابت ہوا ہوگا جیسا میرا وہ ذہنی نقشہ ہوا جو میں نے اکبر کے متعلق قائم کر رکھا تھا۔ مختصر یہ کہ از سر تا پا تمام خیال اُلٹ پلٹ ہوگیا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ اکبر ایک خوش پوش، بھاری بھرکم، مُنڈی ڈاڑھی اور وجیہ صورت کے جج ہوں گے۔ دیکھا تو ایک کمزور، نحیف، سوکھی گردن، چھوٹے سر، دبے ہوئے سینے، فکر زدہ چہرے اور کچیا ڈاڑھی کے ایک صاحب ایک خانہ ساز چوگوشیہ ٹوپی لگائے کرسی پر خمیدہ پشت بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اکبر

الہ آبادی بھی ہیں ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

والد صاحب قبلہ کی تبدیلی کے باعث میں نے کالج کی ایف اے کلاس میں کچھ دیر سے نام لکھایا تھا۔ کچھ میرے مکان سے اکبر کے مکان کی دوری (میں کٹرے میں رہتا تھا اور وہ شہر میں) کچھ خواندگی کے بار کے باعث میں تقریبًا ایک سال تک اکبر کے پاس جانے آنے کا سلسلہ باقی نہ رکھ سکا۔ پہلی مرتبہ عشرت منزل جاکر میں ان سے اپنے ایک ہم جماعت مولوی لائق علی صاحب کے ساتھ ملا جو خان بہادر شیخ احمد حسین صاحب رئیس پریانواں کے فرزند ہیں۔ سید اکبر حسین صاحب سفید پاجامہ، ململ کا کرتہ اور ایک شکستہ فل سلیپر پہنے ایک آرام کرسی پر لیٹے حقّہ پی رہے تھے۔ سیدھے ہاتھ کی جانب ایک اگال دان رکھا ہوا تھا۔ اس میں بار بار تھوکے جا رہے تھے۔ لائق علی صاحب نے میرا تعارف کرایا۔ آنکھوں پر سے چشمہ ہٹاکر مجھے دیکھا۔ پوچھا: اس سے قبل آپ کبھی مجھ سے ملے ہیں؟ میں نے کہا: کبھی نہیں۔ میری نشان دہی پر فرمانے لگے: میں آپ کے تایا مولوی ابوالحسن صاحب بی۔ اے علیگ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ یہاں ہائی کورٹ میں مترجم رہ چکے ہیں۔ لائق علی صاحب سے مخاطب ہوکر کہنے لگے: لکن میاں، تمھارے کالج اور پڑھائی کے کیا حالات ہیں۔ انھوں نے حالات بیان کیے۔ اس دن کچھ زیادہ کھلے نہیں اور نہ کچھ کلام سنایا۔ واپسی پر لائق علی صاحب کہنے لگے، میں ان سے گفتگو کرتے ڈرتا ہوں کہ کس وقت کون سی بات پکڑ لیں اور پھبتی کس دیں۔ کہنے لگے ایک دن

ایک صاحب جو سید صاحب کے دُور کے عزیزوں میں تھے تشریف لائے۔ شب برات کا موقع تھا، انھوں نے پوچھا آج کدھر بھول پڑے۔ انھوں نے کہا آپ سے شب برات کا تحفہ لینے آیا ہوں۔ یہ سُن کر سکوت کیا اور فرمایا ؎

تحفۂ شب برات کیا تمھیں دوں
جانِ من تم تو خود پٹاخا ہو

اس کے بعد سے جب میں شہر میں جاتا تھا، سیّد صاحب سے ضرور ملتا تھا۔ عشرت منزل میں ایک چھوٹا سا پائیں باغ تھا۔ سید صاحب شام کو اس میں بیٹھا کرتے تھے۔ نماز باجماعت کا وہیں انتظام ہوتا تھا۔ آخر زمانے میں نمازِ جمعہ کو جامع مسجد جانا چھوڑ دیا تھا۔ سیڑھیوں پر نہ چڑھ سکنے کا عذر پیش کرتے تھے۔ مولانا محمد کانی صاحب کے وعظ میں بھی کبھی کبھی جایا کرتے تھے۔ میرے ذوقِ سخن سے واقف ہوکر میرے عشرت منزل پہنچتے ہی اشعار سنایا کرتے تھے کبھی زبانی، کبھی بیاض دیکھ کر۔ بیاض اگر باہر میز پر نہ ہوتی تھی تو اندر سے منگوائی جاتی تھی اور بتاتے رہتے تھے کہ کون سے اشعار کس پر کن حالات میں کہے ہیں۔ مگر یہ تاکید بار بار کرتے رہتے تھے کہ میری زندگی میں ان باتوں کو شایع نہ کرنا۔ جیسا جیسا زمانہ گزرتا گیا مجھ کو عزیز تر سمجھنے لگے۔ وقتاً فوقتاً بتاتے رہتے تھے کہ خاص خاص مجبوریوں کے باعث مجھے خاص خاص مصطلحات ایجاد کرنی پڑیں مثلاً سرسیّد کا نام نہیں لانا چاہا تو پیر طریقت، پیرِ نیچر، جنات کول کا بوڑھا۔ تہذیبِ نو کا چندا ماموں، نیچری خلیفہ کہہ کر ذہن کو ان کی طرف منتقل کرنا پڑا۔ مثلاً

کہا پیرِ طریقت نے اکڑ کر اپنی ٹم ٹم پر   یہی منزل ہے جس میں شیخ کا ٹٹو نہیں چلتا

دیوانہ تھی قوم عشق میں پریوں کے   پکڑی گئی اور غلامِ جنات بنی

تہذیبِ نو کے رنگ پہ بلبل بنے ہیں سب   واللہ کیا بہار ہے اس سبز باغ پر

کتا جیسے بہ فکرِ جیفہ دوڑے   یوں دہر پہ نیچری خلیفہ دوڑے

کہیں بُت سے حکومت مراد لی گئی ہے

فتوائے کفر دینا واعظ کی بے بسی ہے
یہ عشقِ بت نہیں ہے اکبر کی پالسی ہے

کہیں محض ضمائر و اشارات سے افراد و اعمالِ حکومت کی طرف خیال راجع کیا ہے ہے

سحر مسلم شکایت با خدا کرد   کہ تفسیرش دسر سیدہا دیدی چہا کرد

سینہ میرا ہے دل نہیں میرا   میری نہیں بات گو زباں میری ہے

چھوڑ کر رنج اپنے مٹنے کا   منتظر ہوں ایمان سے چٹنے کا

اسی طرح گئو ماتا اور دھوتی سے ہندو قوم، لالہ سے گاندھی، سر سے سر سنہا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ع

خدا ہی ہے جو اُن کے سینگ سے بچ جائیں بقرعیدی

سُنا ہے آ چلی ہیں اب گئو ماتا بھی مستی پر

دھوتی و ننگی بہت تنگ آئی تھی پتلون سے (ع غ) اب وہاں پتلون ڈھیلی ہوا سی مضمون سے

یوں تو ہیں جتنے شگوفے سب کو فکرِ باغ ہے
یہ مگر سچ ہے کہ لالہ ہی کے دل میں داغ ہے

پا کر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا سر ہو گئے تو بال کا بھی شوق ہو گیا

چاند خاں کہ کر مولوی نظام الدین صاحب کی ذات مراد لی گئی جنھوں نے قمری ماہ و سال کے بارے میں علماے فرنگی محل سے ایک بحث چھیڑ دی تھی۔ اس بحث سے پہلے اخباروں میں دلچسپی کا مسئلہ آفتاب احمد خاں کی شخصیت اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بنی ہوئی تھی۔ اُن کے انگلستان جانے پر اخباروں کو مولوی نظام الدین حسین صاحب کی وجہ سے چاند کا مبحث مل گیا۔ اُس پر کہہ دیا ع۔غ

آفتاب احمد گئے تو چاند خاں پیدا ہوئے

غرض کہ یہ لطیف کنایات و نکات سمجھانے کے علاوہ اپنے خانگی افکار، نجی جھگڑے اور مخفی خیالات سناتے رہتے تھے اور اپنا دل ہلکا کرتے رہتے تھے۔ آخر عمر میں لوگوں کی تواضع اور مدارات کرنے سے جان چرانے لگے تھے لیکن اس خصوص میں باوجود کافی محتاط ہونے کے میری تواضع کرتے رہتے تھے۔ میں بھی ان کی مزاج داری، رازداری اور راحت رسانی میں حتی الوسع کمی نہیں کرتا تھا۔ اگر کھانے میں شریک ہونے کے واسطے نہایت اصرار و ضد سے کہتے تھے تو بیٹھ جاتا تھا کہ زیادہ انکار سے خفا نہ ہوں۔ مجھے اُن کا

یہ کلمہ بہت پیارا معلوم ہوتا تھا کہ "آپ خوش خور نہیں" اور چاہتا تھا کہ اُن کی زبان سے بار بار اس کا اعادہ ہوتا رہے ؎

ازبال و پرِ غبارِ تمنا فشاندہ ایم　　برشاخِ گل گراں نبود آشیانِ ما

بات بات میں لطائف منہ سے نکلتے۔ افسوس ہے کہ ۱۹۱۹ء سے قبل مجھے ان جواہرات کے جمع کرنے کی فکر نہ ہوئی۔ اس سال مجھے خیال پیدا ہوا کہ ان کی سوانح عمری لکھوں۔ اُس کے بعد سے اُن سے اور اُن کے احباب سے دریافت کر کے مواد جمع کرتا رہا۔ یہ یادداشتیں ایک زمانے تک غیر مرتّب حالت میں پڑی رہیں۔ جب حالات نے کچھ موقع دیا تو اُن کو ترتیب سے جمایا۔ بعض یادداشتوں میں تاریخ کا تعین نہ ہو سکا، ان کو بغیر تاریخ کے تعین کے رکھنا پڑا۔ ایسی یادداشتیں ڈائری کے اوراق کے باب میں ابتدا میں درج کر دی ہیں۔ ان یادداشتوں کی طرح ان خطوط کو بھی مہذب و محفوظ کرتا رہا جو سیّد صاحب کبھی کبھی مجھے لکھتے رہتے تھے۔ متعدد خطوط لوکل ہیں جو شہر سے کٹرہ ڈاک کے ذریعے بھیجے گئے ہیں۔ بعض محض اطلاعی ہیں جیسے پوسٹ کارڈ مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۹۱۱ء "خواجہ حسن نظامی صاحب آج تشریف لائے ہیں غالباً دو چار روز رہیں اطلاعاً لکھتا ہوں" اگر میں ایک دو ہفتہ عشرت منزل نہیں جاتا تھا تو لوکل خط کے ذریعے توجہ دلاتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ میں سائیکل سے گر گیا۔ ٹانگ میں چوٹ آئی۔ دس بارہ دن تک عشرت منزل نہ جا سکا۔ ۴ جنوری ۱۹۲۰ء کو لوکل پوسٹ کے ذریعے ایک کارڈ وصول ہوا اس میں لکھا تھا " ڈیر سر، کئی دن سے آپ نہیں ملے۔ خدا کرے بائیسکل بخیریت ہو، اُسی کی تقویت پر یہ شکایت ہے" پوسٹ

کارڈ پاکر میں عشرت منزل گیا اور عرض کیا کہ میں سنا کرتا تھا کہ شعرا الہامی باتیں کرتے ہیں، آپ کی قوتِ متخیلہ نے تو اس کا ثبوت دے دیا۔ فرمایا: "کیسے؟ میں نہیں سمجھا" میں نے کہا آپ نے میری عدم حاضری پر بائیسکل کی خیریت پوچھی، واقعی نہ بائیسکل ٹھیک تھی اور نہ میں تیں بائیسکل سے گر گیا تھا، ایک ہفتہ تک ٹانگ کی چوٹ نے چلنے سے معذور رکھا، افسوس کرکے فرمایا: "برا ہُوا اجی مجھے خواہ کوئی قدامت پسند کہے یا قدامت پرست، مجھے تو عہدِ حاضر کی اچھّی سے اچھّی ایجاد میں بھی مضرت کے پہلو نظر آتے ہیں خواہ وہ موٹر ہو، ہوائی جہاز ہو یا بائیسکل ہو۔ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔" زرا غور کرکے فرمانے لگے اور بائیسکل تو دیکھو مجسم روگ ہے۔ مرض بائی (Bi) سے شروع ہوتا ہے پھر سِک (Sick) ہوتا ہے۔ پھر اِل (Ill) ہوتا ہے یوں لفظ بائی سِک اِل (Bicycle) بنتا ہے۔ اسی طرح بات میں بات پیدا کرتے رہتے تھے۔ یہ لطیفے آیندہ باب روز نامچہ میں آئیں گے پہلے خطوط نقل کرتا ہوں۔

۱۔ پوسٹ کارڈ عشرت منزل سے

الہ آباد ۸ر اکتوبر ۱۹۱۹ء

عزیزِ من سلمہ اللہ تعالیٰ۔ آپ نے میری خبر نہ لی۔ میں ڈرتا ہوں بالآخر نرے بی۔اے نہ رہ جائیے۔ اب اگر محنتِ تحریر گوارا ہو سکے تو انتخابِ حصّہ سوم کا وقت آگیا ہے۔ شب کو یہیں تشریف رکھیے میں اگرچہ بہت ناتواں ہوں اور اکثر شکایتیں موجود ہیں لیکن پہلے کی نسبت اچھا ہوں۔ آپ والد صاحب سے میرا سلام فرما دیجیے۔

پتا :۔ شہر الہ آباد، کٹرہ ۔ مکان مولوی ضیاء الدین صاحب سنٹرل ناظرِ عدالتِ دیوانی۔ عزیزی مولوی قمر الدین صاحب بی۔اے کو پہنچے۔

۲۔ دستی پرچہ عشرت منزل سے

پانچ پیسے بھر کم سیر بھر مکھن پہنچا۔ Many thanks سیر بھر اور چاہیے، حکم دیجیے۔

اکبر حسین

۳۔ پوسٹ کارڈ

دہلی، درگاہ حضرت سلطان المشائخ، ڈاک عرب سرائے۔

شفیق و ہمدرد من سلمہ اللہ تعالیٰ۔ کبھی کبھی عشرت منزل میں تشریف لے جائیے اور میری چھوٹی بہن یعنی اس چھوٹی لڑکی کی (جس کو آپ نے دیکھا ہے) دادی سے کہلا بھیجیے کہ کچھ لکھوانا ہو تو میں لکھ دوں، انھوں نے ایک مرتبہ شکایت کی تھی کہ ٹھیک لکھنے والا نہیں ملتا۔ میری شکایتیں بدستور ہیں۔ لیکن درگاہ شریف سے دلچسپی ہے۔ خدا آپ کو کامیاب کرے۔ اگر زندگی رہی اور یہاں رہا تو آپ کو کبھی بلاؤں گا۔ جو نقل کتاب آپ نے شروع کی تھی وہ کام یہاں ایک خوش عقیدہ نیک نوجوان نے کرنا شروع کیا ہے اگرچہ وہ نظرِ تحقیق کہاں۔ ناظر صاحب کو تسلیم۔

اکبر حسین

(تاریخ لکھنا بھول گئے مجھے یہ کارڈ الہ آباد میں ۷ نومبر ۱۹۱۹ء کو ملا)

پتا :۔ شہر الہ آباد محلہ کٹرہ، مکان مولوی ضیاء الدین صاحب سنٹرل ناظرِ عدالتِ دیوانی۔ خدمت مکرمی منشی قمر الدین صاحب بی۔اے

دہلی تشریف لے گئے تھے تو مجھے فرما گئے تھے کہ پروف دیکھ کر بعدِ اصلاح میں اطلاع دے دیا کروں چنانچہ حصّۂ اوّل میں چند غلطیاں کتابت کی معلوم ہوئیں، میں نے اطلاع دی۔ اس پر خط آیا:

۴۔ پوسٹ کارڈ

دہلی، ۲۸ر نومبر ۱۹۱۹ء

برادرِ عزیز۔ آپ نے مہر و کرم غلط لکھا، مہرِ کرم ٹھیک ہی یعنی آپ کے کرم کے آفتاب نے ہم کو چمکا دیا اور ذرّہ نوازی کی۔ مہر کے معنی آفتاب۔ امید کہ فوراً اس اصلاح کو واپس لیجیے۔ آپ کی عنایتوں کا کہاں تک شکریہ ادا کروں۔ اللہ جلد ملنے کی صورت نکالے۔ کبھی یہ خیال آتا ہی کہ الہ آباد آؤں تو چند روز کٹڑے میں رہوں۔ بشرطیکہ آپ لوگوں سے قریب جگہ ٹھیرنے کی ملے۔ گو کچھ خرچ بھی ہو۔ مقبول احمد صاحب کا خط پہنچا، میری طرف سے بہت بہت سلام شوق کہہ دیجیے گا۔ خواجہ صاحب کی طرف سے دعا   اکبر حسین

پتا: الہ آباد کٹڑہ جے سنگھ سِوائی۔ مکان مولوی ضیاء الدین صاحب سنٹرل ناظرِ عدالتِ دیوانی۔ عزیزی مولوی قمر الدین صاحب بی اے سلمہ اللہ تعالیٰ۔

۵۔ ۲۸ر نومبر ۱۹۱۹ء کو میں نے پروف حصّۂ اوّل دیکھ کر خط لکھا تھا جو دوبارہ چھاپا جا رہا تھا۔ اس میں جہاں جہاں میرے خیالات سے اختلاف کیا تھا وہاں جوابی فقرے لکھ کر اس خط کو واپس کر دیا۔

اسی حصّۂ اوّل کے ایک شعر سے

حسن جس چیز میں ہو دیکھ کے خوش کر دل کو   بند کر لے مگر آنکھیں اگر انسان ہی ...

کی نسبت میں نے لکھا "انسان" سے مطلب صاف نہیں ہوتا، یہاں انسان کی بجائے امکان تو نہیں ہے؟ اس پر لکھا: انسان ٹھیک ہے یعنی انسان کا حُسن نہ دیکھ۔ امکان بے معنی ہے۔ جملہ خوش نما اشیا کیوں نہ دیکھیں دیوانہ تو انسان کا حسن کرتا ہے اس لیے منع کیا۔

حصۂ اوّل کے ایک دوسرے شعر کے بارے میں ؎

بے رونقیٔ انجمنِ عشق نہ چاہی
خالی جو ملی کوئی جگہ آہ بھر آئے

میں نے لکھا تھا کہ "آہ بھر آئے" کیا بات ہوئی اس کی بجائے "اشک بھر آئے" ہوگا۔ اس پر لکھا "آہ ٹھیک ہے، اشک غلط ہے یعنی جو خالی جگہ دیکھی اس جگہ آہ بھر دی"۔ آپ کا بہ دل ممنون ہوں۔ اگر زندہ رہا تو ملوں گا۔ میر صاحب کو مزاج پرسی کا خط آج لکھا ہے۔ اکبر (میر صاحب سے چھوٹے بہنوئی مراد ہیں جن کی علالت کی اطلاع میں نے دی تھی)

۶۔ کارڈ عشرت منزل سے

الہ آباد، ۲۲ر دسمبر ۱۹۱۹ء

ڈیر قمر۔ سلمہ اللہ تعالےٰ۔ سردی بڑھی، دل گھبرایا۔ آپ کا فراق شاق تھا۔ کل اکسپریس میں ریزرو درجہ کرکے چلا آیا۔ صرفہ بے حد ہوا لیکن مجبوری تھی۔ امید کہ آپ خوش ہوں اور فوراً تشریف لائیں۔ اکبر حسین

پتا:۔ الہ آباد، کٹرہ جے سنگھ سوائی، مکان مولوی ضیاء الدین صاحب سنٹرل ناظر عدالت دیوانی۔ عزیزی مولوی قمر الدین صاحب بی۔ اے

۷۔ کارڈ عشرت منزل سے

۴ر جنوری ۱۹۲۰ء

ڈیر سر۔ کئی دن سے آپ نہیں ملے۔ خدا کرے بائیسکل بخیریت ہو، اُسی کی تقویت پر یہ شکایت ہے۔ سردار صاحب کا الطاف نامہ آیا ہے۔ افسوس ہے کہ اس وقت اشتدادِ مرضِ لاحقہ کا وقت ہے، بہ آسانی نہ آسکوں گا۔ معذرت لکھ دی ہے شکریہ یاد آوری اور کیا ہے۔ عبدالماجد صاحب فلاسفر لکھنوی ۱۰ ۱۱ر جنوری کو مجھ سے ملنے کو آنے والے ہیں۔ ۱۴ر کو نوح صاحب ناروی آنے والے ہیں۔ اطلاعًا تحریر کیا۔ ناظر صاحب کی خدمت میں تسلیم۔ اکبر

پتا:۔ کٹرہ جو سنگھ سوائی، شہر الہ آباد، مکان مولوی ضیاءالدین صاحب سنٹرل ناظرِ عدالتِ دیوانی۔ مولوی قمرالدین صاحب بی۔ اے

۸۔ مئی ۱۹۲۰ء کے رسالۂ نقیب میں کلامِ اکبر پر ریویو کے سلسلے میں اس رباعی

ہر ایک کو نوکری نہیں ملنے کی ہر باغ میں یہ کلی نہیں کھلنے کی
کچھ پڑھ کے تو صنعت و زراعت کو دیکھ عزت کے لیے کافی ہے اے دل نیکی

کی نسبت میں نے لکھ دیا تھا کہ مصرع چہارم میں کافی کی "ی" تقطیع سے گر جاتی ہے۔ یہ ریمارک اکبر کو ناگوار گزرا۔ اڈیٹر نقیب کو خط لکھا کہ مضمون نگار صاحب نے غلط اعتراض کیا ہے، یہ مرسلہ جواب میں شایع کر دیا جائے پھر بعد کو غالبًا سوچا کہ بات طول پکڑے گی۔ دوسرا خط اڈیٹر صاحب کو لکھا کہ مرسلہ جواب شایع نہ کیا جائے۔ چنانچہ ۱۸ر اگست ۱۹۲۰ء کو

مولوی وحید احمد صاحب اڈیٹر نے مجھے ایک خط میں لکھا "سید صاحب قبلہ کا والانامہ آیا تھا، آپ کے مضمون کی ایک دو جگہ تصحیح کی تھی چنانچہ تصحیح لکھی جا چکی تھی کہ دوسرا خط آگیا کہ "شاید مضمون نگار صاحب خفا ہو جائیں اس لیے تصحیح کو شایع نہ کیا جائے۔ چنانچہ اب اس کو کٹوا دیا اور شایع نہیں کروں گا۔"

۹۔ ۲۷ راگست ۱۹۲۰ء کو خواجہ حسن نظامی صاحب کو میری نسبت لکھا "آج صبح میں ایک گریجویٹ بدایونی سے کہہ رہا تھا کہ آپ کے مرید ہو کر سلسلۂ نظامیہ میں داخل ہو جائیں اور کوشش و محنت سے خلافت حاصل کریں۔" اس کا مفصل حال ڈائری میں درج ہے۔

۱۰۔ ۷ر فروری ۱۹۲۱ء کو عشرت منزل سے ایک کارڈ کٹرے میں مولوی نورالحسن صاحب کو لکھا۔ خواجہ حسن نظامی صاحب کل بدھ کو دو پہر کی ٹرین میں تشریف لانے والے ہیں۔ رات خط آیا اطلاعاً عرض ہے۔ اگر کچہری کر کے آسکیے تو بہتر ہے۔ میرا ملازم رخصت پر گیا ہے۔ کوئی خادم باسلیقہ موجود نہیں۔ علیل ہوں، تنہا ہوں۔ کارڈ اطلاعاً لکھ دیا۔ ممکن ہو تو قمرالدین صاحب کو خبر کر دیجیے۔ اکبر حسین

۱۱۔ ۱۶ ر فروری کو ایک دوسرا کارڈ عشرت منزل سے مولوی نورالحسن صاحب کو لکھا۔

الہ آباد۔ ۱۶ ر فروری ۱۹۲۱ء صبح

ڈیر فرینڈ رات شاہ نظام الدین صاحب دیگر اڈیٹر نقاد آگرہ سے تشریف لائے ہیں۔ عزیزی قمرالدین صاحب کا ایڈرس مجھ کو

معلوم نہیں ۔ براہ مہربانی آپ اُن کو مطلع فرماویں اگر ملنے کا شوق ہو
تو تشریف لائیں ۔ میں قبض اور درد سر کی ایسی تکلیف میں مبتلا ہوں
جس کا بیان دشوار ہے ۔ اللہ جلد نجات دے ۔ اگر اچھا رہا تو ۱۹ فروری
کو قوالی کا قصد ہے ۔

اکبر

۱۲ ۔ ۱۸ مارچ ۱۹۲۱ء کو مولوی نورالحسن صاحب کو عشرت
منزل سے کارڈ لکھا ۔

الہ آباد ۔ عشرت منزل ۱۸ مارچ ۱۹۲۱ء

جناب من

مولوی قمرالدین صاحب سے فرما دیجیے کہ جنت الفردوس جو
آپ میری غیبت میں اٹھالے گئے تھے ، باوجود وعدہ آپ نے
واپس نہیں فرمائی ۔ عشرت صاحب دیکھنا چاہتے ہیں ۔ میں کل واپس
آیا ۔ زندہ رہا تو ملنا ہوگا ۔ قمرالدین صاحب کا ایڈرس معلوم نہیں ۔
نجم الدین صاحب (میرا چھوٹا بھائی حافظ حکیم نجم الدین) کو دعا ۔

اکبر حسین

مولوی نورالحسن صاحب نے اس کارڈ پر حسب ذیل عبارت
لکھی اور مجھ کو بھیج دیا " مرد آدمی پھر خبر نہ لی کہ زندہ رہا یا مرگیا ۔
بھائی صاحب ، کتاب عروض واپس کیجیے اور آیندہ سے توبہ کیجیے ۔"

کچھ تو سید صاحب کے بے موجب الزام اور کچھ نورالحسن صاحب
کے بھڑکانے کے باعث دماغ میں آگ سی لگ گئی ۔ غصے میں سید
صاحب کو حسب ذیل خط لکھ بھیجا :۔

۱۳ ۔ ۲۲ مارچ ۱۹۲۱ء

معظم و مکرم بندہ تسلیم

چودھری رحم علی صاحب کی اطلاع پر کہ خان بہادر صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے اور جنت الفردوس طلب فرمائی ہے۔میں جناب سے ۱۰ر مارچ کو ملا تھا اور عرض کیا تھا کہ اسی عروض کی کتاب سے مجھے امتحان ایم۔ اے میں کچھ مدد لینا ہے۔آپ نے فرمایا کہ پرسوں میں پرتاب گڑھ جاؤں گا کل وہ کتاب حافظ نجم الدین صاحب کے ذریعے روانہ کر دیجیے۔ اتفاق سے دوسرے دن جمعہ تھا۔

مولانا محمد کافی صاحب کے مدرسے میں جہاں نجم الدین پڑھتا ہے چھٹی تھی۔ وہ چوک نہیں گیا۔میری مصروفیت جناب کو معلوم تھی۔ ۲۰ ار کو دوپہر کو امتحان ختم ہوا۔ شام کو میں عشرت منزل پہنچا۔ پھاٹک کھلا تھا۔آپ کا کمرہ بند تھا۔ مکان میں کوئی نہ تھا۔تھوڑی دیر ٹہلتا رہا کہ طفیل یا سلیمان کوئی آ جائے تو اس کو کتاب دے دوں اور آپ کی واپسی کی تاریخ دریافت کر دوں۔ مگر کوئی نہیں آیا مجبوراً مع کتاب واپس آنا پڑا۔ سب رجسٹرار صاحب کو کئی روز سے بخار آرہا ہے انھوں نے آپ کا ۱۸ر مارچ کا آیا ہوا کارڈ کل بھیجا جس میں لکھا تھا کہ ”قمرالدین صاحب سے فرما دیجیے کہ جنت الفردوس جو آپ میری غیبت میں اٹھا لے گئے ہیں، باوجود وعدہ واپس نہیں کی“ مذکورہ بالا امور اور اتفاقات کی وجہ سے کتاب دو ہفتے تک آپ سے علیحدہ رہی جو متواتر تقاضوں کی نوبت پہنچی۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ امید ہے کہ آپ از راہ شفقتِ بزرگانہ مجھے معاف فرماویں گے۔آیندہ میں آپ کے لیے ایسی پریشان خیالی کا باعث نہ ہوں گا۔کتاب میوۂ شیریں جو جناب نے دی تھی کہ

پڑھ کر رپورٹ کرنا لیکن افسوس ہی کہ اب تک نہ پڑھ سکا۔ واپس کرتا ہوں۔ اس کے جواب میں دو گھنٹے بعد ہی حسب ذیل دستی خط آیا۔

۱۴۔ الہ آباد، ۲۲ر مارچ ۱۹۲۱ء

عزیز من

آپ نے اتنا بڑا خط لکھ ڈالا اور یہ نہ لکھا کہ کب ملیے گا۔ صرف میرے رپورٹر نہ بنیے۔ میرا خیال رکھیے۔ بیماری کے سبب سے آپ ایسے دوستوں کی ہمدردی اور مصاحبت کا بہت محتاج ہو گیا ہوں۔ کتاب اور قلم کے بارے میں ہم اور آپ دونوں معاف ہیں۔ کچھ ضرورتِ معذرت نہیں۔ اس اثنا میں بہت علیل رہا۔ چراغ سحری سمجھیے۔ آپ کی کامیابی کا خواہاں۔ اکبر

۱۵۔ ۵ر اپریل کو مولوی وحید احمد صاحب نے مجھ کو ایک لفافہ خاں بہادر صاحب کے توسط سے روانہ کیا جس میں نسخۂ کلیاتِ اکبر حصۂ سوم کی نسبت جو میری تحریک کی بنا پر نقیب پریس بدایوں میں شایع ہوا لکھا کہ کلیات حسبِ مدعا چھپ رہا ہی، وسطِ مئی میں انشاءاللہ تیار ہو جائے گا۔ خان بہادر صاحب نے اسی لفافے پر حسب ذیل عبارت لکھ کر مجھے روانہ کر دیا۔

"یہ خط کل آیا۔ چونکہ آپ کی تشریف کی امید جلد نہ تھی لہذا ڈاک میں بھیجوں گا۔ یا آنکہ عزیزی نجم الدین مل جائیں۔ A. H. ۶/۴ ۲۱"

۱۶۔ ۸ر مئی ۱۹۲۱ء کو مجھے اور مولوی نورالحسن صاحب سب رجسٹرار کو کھانے پر دعوت دی۔ ہم دونوں بوجہ مجبوری وقت پر نہ پہنچ سکے تو "خدا کے بندو" سے خطاب کر کے نورالحسن کے نام

خط بھیجا۔" بی نیدھا نے بہت اہتمام سے دوچار ہانڈیاں پکائیں ۹ بج گئے، لیے بیٹھی ہیں، جھنجلا رہی ہیں۔ میں کہتا ہوں پلاؤ مزعفر تو ہی نہیں گوشت ترکاری بورانی کی بات ہی کیا ہے۔ لیکن دل میں کہہ رہا ہوں کہ ایسی وعدہ خلافی اور بے پروائی چہ معنی دارد۔ قمرالدین صاحب کو تسلیم   اکبرحسین الہ آباد

۱۷۔ کارڈ عشرت منزل سے

الہ آباد۔ ۱۵ مئی سنہ ۱۹۲۱ء

مکرمی زاد الطافکم

بسکٹ بہت عمدہ ہیں آپ کی محبت وفیاضی کا کہاں تک شکریہ ادا کروں۔ خداوند تعالیٰ شاد آباد رکھے۔ اب گرمی بہت ہے اور میری طبیعت صحیح نہیں۔ دو تین دن میں پرتاب گڑھ جانے کا ارادہ ہے، عشرت بلاتے ہیں۔ یہاں بہ سبب تنہائی کے پریشان بھی ہوں۔ آیندہ مراسلت انشاءاللہ پرتاب گڑھ سے ہوگی معلوم نہیں کالج میں کب سے کب تک تعطیل رہے گی۔ جواب پرتاب گڑھ بھیجیے۔ بنگلا سید عشرت حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر۔   اکبرحسین

۱۸۔ کارڈ پرتاب گڑھ سے بدایوں

پرتاب گڑھ، بنگلا سید عشرت حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر   ۱۳ جون سنہ ۱۹۲۱ء

ڈیر قمر سلمہ اللہ تعالیٰ۔ شوال میں آپ کے خط نے عید کے چاند کی خوشی پیدا کی۔ بیمار و ناتواں تو میں تھا ہی۔ گرمی کی شدت نے اور بھی بے حواس رکھا۔ بالکل بھولا ہوا تھا کہ آپ ایسا ایک انیس وغم گسار موجود ہے۔ رات کچھ ترشح ہوا۔ آپ کے خط سے بھی مسرت ہوئی۔ کیا ناظر صاحب

نے رخصت لی ہے؟ علی گڑھ کب آئیں گے۔ میں اپنی نسبت ابھی کچھ نہیں
کہہ سکتا کہ کہاں مقام ہوگا۔ بہ لحاظِ حالات دل مضطرب ہے۔ ماحول
موافق کی تلاش میں ہوں جب تشریف لائیے تو مجھ کو اطلاع دیجیے گا۔ آپ
کے دوست رجسٹرار صاحب سنا ہے تین ماہ کی رخصت پر جاتے ہیں۔
اشعار بہت جمع ہو گئے ہیں آپ سے ملنا ہو تو انتخاب کی ٹھہرے ہمارے
دوست فلاسفر عبدالماجد صاحب لکھنوی مجھ سے ملنے کو یہاں آنے
والے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی صاحب ۱۷ شوال کے بعد قصد کرنے
والے ہیں۔ کاش آپ بھی موجود ہوں، دو چار دن لطف رہے۔ نہایت مسرت
ہوئی کہ آپ نے روزے رکھے۔ طاعتِ الٰہی کی طرف توجہ ہے۔ کیوں
نہ ہو کُلُّ شَیْءٍ یرجع الیٰ اصلہ۔ عزیزی نجم الدین کا عقد مبارک ہو۔ وہ کب
واپس آئیں گے۔ سلسلۂ مراسلت قائم رکھیے۔ یہاں تو ۲۹ ہی کا چاند
ہوا۔ الہ آباد اور لکھنؤ میں بھی۔ لیکن اکثر جگہ پنج شنبہ کو عید ہوئی کیوں کہ
چاند نہیں دکھائی دیا۔ وحید احمد کو سلام۔ اکبر

۱۹۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو لٹریچر کی اسسٹنٹ پروفیسری
کی ضرورت چھپی۔ میں نے بھی ایک درخواست روانہ کی۔ اس سلسلے
میں میر صاحب نے مولوی الیاس برنی صاحب کو حسبِ ذیل سفارشی
و تعارفی خط لکھا۔

الہ آباد۔ ۱۷ جولائی ۱۹۲۱ء

عزیزی و حبیبی سلمہ اللہ تعالیٰ۔

میرے دوست منشی قمرالدین صاحب بی۔ اے رئیس بدایوں
نے عثمانیہ یونیورسٹی میں نوکری کے لیے درخواست بھیجی ہے۔ بہت

اچھّے آدمی ہیں - نمازی ہیں - ذوقِ سخن خوب رکھتے ہیں - ان کی کام یابی کے لیے آپ جو کچھ کر سکتے ہوں اس سے دریغ نہ کیجیے، ممنون ہوں گا - اور دوستوں سے بھی کہہ دیجیے گا - اپنی خیریت سے مطلع فرمائیے۔ بکرر یہ کہ ۲۲ جولائی کو انتخاب ہے - اُردو لٹریچر کی اسسٹنٹ پروفیسری کی درخواست ہے لہذا ۲۲ جولائی سے پہلے تحریک ہونا چاہیے،

آپ کا دعاگو

اکبر حسین

پتا: حضرت الیاس برنی، ترپ بازار، حیدرآباد (دکن)

۲۰- سید اکبر حسین صاحب سے کسی نے کہہ دیا کہ مولانا محمد علی صاحب جوہر آپ سے کبیدہ ہیں کہ آپ نے ان کے متعلق یہ شعر لکھا ہے:

بدھو میاں بھی حضرتِ گاندھی کے ساتھ ہیں
گو خاکِ راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

یہ سُن کر وحشت ہوئی - مولانا کو خود لکھنا خلافِ مصلحت سمجھا - مجھ سے کہا آپ لکھ دیجیے اور اُن کا شبہہ دور کیجیے - میں نے حسب ارشاد مولانا صاحب کو یہ خط لکھا:-

الہ آباد، ۲۲ اگست سنہ ۱۹۲۱ء

معظم و مکرم جناب مولانا صاحب قبلہ تسلیم

اس مرتبہ آپ الہ آباد تشریف لائے تو میں یہاں موجود نہ تھا۔ ورنہ حاضرِ خدمت ہوتا - پرسوں میں نے لسان العصر جناب اکبر حسین صاحب سے سنا کہ اُن کے "بدھو میاں" والے شعر کی نسبت آپ کو گمان ہے کہ آپ کے بارے میں لکھا گیا ہے - میں نے اُن سے دریافت

کیا وہ افسوس کرتے ہیں کہ مولانا محمد علی صاحب کو میری طرف سے ایسا گمان پیدا ہوا۔ فرماتے تھے کہ ان بھائیوں کی نسبت جو میری رائے ہے وہ ان اشعار سے ظاہر ہے ؎

ایشیا نے کمر تو باندھی ہے | کوئی شوکت ہے کوئی گاندھی ہے
مگر اب تک بہت سے ہیں اڑیل | وہی پشتک ہے وہی کاندھی ہے

دیگر

غ | دشوار ہے مستحقِ آزر ہونا
آساں نہیں علی برادر ہونا

فرماتے ہیں کہ بدھو والے شعر کی نسبت لوگ غلط خیالات پھیلا رہے ہیں۔ اس طرف گاندھی جی کو بھلاتے ہیں کہ تم پر اعتراض ہے اور آندھی سے بربادی مراد ہے۔ یہ مقصود ہرگز نہیں ہے۔ مہاتما جی کے متعلق یہ اشعار ان کی تعریف کے لیے کیا کم ہیں ؎

ہر چند بگولہ مضطر ہے ایک جوش تو اس کے اندر ہے
اک رقص تو ہے اک وجد تو ہے بے چین ہی برباد سہی

دیگر

آپ نے طاقت کی تو جولانیاں دیکھیں بہت
ضعف کے ہیجان کا بھی اب تماشا دیکھیے

ضعف کے ہیجان سے مقاومتِ مجہول Passive resistance مراد ہے امید کہ آپ خیریت ہوں گے۔

نیاز کیش
قمر الدین احمد

میں نے یہ خط سُنا کر روانہ کر دیا۔ تحریر کا یہ آخری کام تھا جو سید صاحب نے مجھ سے لیا۔ جوہر کی خدمت میں یہ صفائی پیش کیے ہوئے دو ہفتے مشکل سے گزرے تھے کہ فرشتۂ اجل نے اکبر پر ہاتھ صاف کیا اور جج صاحب صفائی کے لیے اُس عدالتِ اعلیٰ میں پہنچ گئے جہاں سے ع
کچھ کسی کی خبر نہیں آتی

میرا ایک قطعہ ہے ؎

کچھ لوگ سانحے کے عبادات لائے ہیں — اور کچھ سروں میں عشق کے سودے سمائے ہیں
یہ دیکھ کر کہ رحمتِ رب ہی خطا طلب — ہم تو گناہ و شرم کا سرمایہ لائے ہیں

۲۱۔ خط وحید احمد صاحب اڈیٹر نقیب

بدایوں، ۱۲ ستمبر ۱۹۲۱ء

قمر صاحب۔ تسلیم

میں گویا گوشہ نشین ہوں اور دنیا سے بالکل علیحدہ۔ آپ کا خط ابھی ملا۔ خط نہ تھا گولہ تھا۔ میں اس خبرِ جاں کاہ کو سن کر مبہوت ہو کر رہ گیا۔ مرنے سے تو انکار نہیں۔ مرنا تو ضروری ہی تھا مگر خان بہادر صاحب کی ذات ایک دُرِ بے بہا تھی اور قوم کی رہبری و رہنمائی کے لیے بے مثل فائدہ۔ اس وجود کی ابھی قوم و ملت کو بہت ضرورت تھی مگر خدا ہی جانے کہ اُس کی اس میں کیا مصلحت ہے۔ یہ نقصانِ عظیم ہے اور قوم کی بدقسمتی میں رتی برابر شک نہیں۔ سید عشرت حسین صاحب کو تار اور خط ابھی لکھ رہا ہوں۔ امید کہ آپ بعافیت ہوں گے۔ پارسال غالباً اسی زمانے میں آپ یہاں تھے۔

آپ کا وحید

۲۲۔ اکبر مرحوم کے انتقال کے بعد خواجہ حسن نظامی صاحب نے

ایک مضمون میں اعلان کیا تھا کہ وہ سوانح عمری مرتب کرنے کے واسطے الہ آباد آئیں گے۔ اس پر میں نے خواجہ صاحب کو ایک خط بھیجا، اُس کا جواب آیا۔

دہلی، ۱۶ ارمحرم الحرام ۱۳۴۰ھ

بھائی قمرالدین صاحب سلام علیکم

خط ملا۔ افسوس بدایوں کے پیڑوں سے محروم رہا۔ خیر آپ کی دید مجھے سب کچھ ہے۔ حضرت اکبر میرے مولی تھے۔ دنیا نے اُن کو شاعر مانا، میں نے اُن کو کچھ اور جانا۔ پھر احسان کا کیا ذکر۔ اور دنیا میں تو آدمی وہی ہے جو مرنے کے بعد کسی کا بنے۔ بنی کے تو سب ساتھی ہیں۔ آپ سے تو بہت کام لینا ہے۔ اکتوبر کے لیے تیار رہیے۔ میں جبراً آپ کو اپنا بناؤں گا کہ آپ سب سے زیادہ مجھ کو وہاں درکار ہیں۔

نیازمند

حسن نظامی

۲۳۔ ۱۰راگست ۱۹۲۹ء کو خواجہ صاحب نے بدوران قیام حیدرآباد "منادی" میں شایع کیا تھا "مولانا قمرالدین صاحب بدایونی ہیڈ ماسٹر کاماریڈی حضرت اکبر الہ آبادی کے مخصوص احباب میں سے ہیں۔ اس واسطے وہ مجھ کو بہت عزیز ہیں۔ یہاں کئی سال سے ملازمت کرتے ہیں۔ پہلے کاماریڈی سے خط بھیجا تھا، اب خود ملنے آئے۔"

خطوطِ اکبر شایع کرنے سے قبل خواجہ حسن نظامی صاحب الہ آباد آئے تھے۔ مولوی نورالحسن صاحب وغیرہ سے خطوط لے کر

ان کو اپنے نام کے خطوط کے ساتھ اگست ۱۹۲۲ء میں شایع کرادیا۔ سوانح عمری کوئی مرتّب نہ ہوئی۔ میں ابتدا ہی سے حیاتِ اکبر لکھنے کے خیال سے مواد جمع کرتا آرہا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے نام کے خطوط خواجہ صاحب کو شایع کرنے کو نہیں دیے کہ اس علیحدہ سوانح عمری کے کام آئیں گے۔ جب سے کافی فرصت اور اطمینان کے انتظار میں اتنا زمانہ گزر گیا۔

ایک انگریزی مقولہ ہے:- That which can be done at any time is never done at all

حیلہ جو طبیعت جس کام کو یہ کہہ کر ٹالتی رہتی ہے کہ جب چاہیں گے کرلیں گے وہ بسا اوقات کبھی نہیں ہوتا۔ آخر یہ تساہل کب تک۔ اگر بے عملی کے یہی لیل و نہار رہیں تو حیاتِ عمر ختم ہو جائے گی اور حیاتِ اکبر وجود میں نہ آئے گی۔ اس خیال کے تحت میں اس سال گرما کی تعطیل میں جم کر بیٹھ گیا اور بزم کے منتشر نوٹ مرتّب کرکے صاف کر ڈالے۔ غرض کہ یہ غنچۂ مراد اتنے عرصے کے بعد اب اس قابل ہوا ہے کہ صاحبانِ ذوق کے مشام تک اپنی خوشبو پہنچائے۔

فردوسی شاہ نامے کے لیے بیس برس تک سوچتا رہا کہ اس کو کس کے نام سے منسوب کیا جائے۔ کہتا ہے ؎

سخن را نگہ داشتم سال بیست
کہ بینم سزاوارِ ایں گنج کیست

حالات کی عجیب یکسانیت ہے کہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۹ء تک یعنی کامل بیس سال تک اس تالیف بزمِ اکبر کے متعلق میں یہ تصفیہ نہ کرسکا

کہ "سزاوار این گنج کیست" ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ کوئی امر وقت سے پہلے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ اب وقت آیا تو اپنی بست سالہ سعی کے اس نتیجے کو اُردو کے مسیحا ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی خدمت میں پیش کرتا ہوں کہ اُن سے زیادہ کوئی اور اس کا مستحق نہیں ؎

ہر کس کہ دید روئے تو بوسید چشم من
کارے کہ کرد دیدۂ من بے بصر نہ کرد

باب سوم

میری ڈائری کے اوراق

سید صاحب نے ایک دن دریافت فرمایا: مغرب ہماری کس چیز کا دشمن ہے؟ میں نے عرض کیا: مذہب کا۔ فرمایا: نہیں، اہلِ مغرب کے نزدیک مذہب خود کوئی قابلِ احترام شے نہیں ہے پھر ان کی بلا سے آپ مسجد میں جان دیں یا گرجا میں مریں، البتہ زندگی بھر اُن کا پاٹ (پاخانہ) اٹھانے میں پس و پیش نہ کریں۔ گرجا خود ان کے لیے ایک سطفِ نظر اور حظِ نفس کا مرکز ہے۔ میں نے عرض کیا اہلِ مغرب ہماری دولت کے دشمن ہیں۔ فرمایا: ہاں دولت کے دشمن کبھی تھے لیکن اب ہمارے پاس دولت رہی کہاں اور اُن کی دشمنی ہے کہ اب تک بہ پایاں نمی رسد۔ میں نے عرض کیا: آپ فرمائیے، میری سمجھ میں نہیں آیا فرمایا: اہلِ مغرب ہمارے اس تخیّل کے دشمن ہیں کہ "پدرم سلطان بود" ہم اب تک نہیں بھولے اور اس وجہ سے ہم کو ہٹی میں ملانے اور پست فطرت لوگوں کو ہم پر مسلط کرنے کے درپے ہیں کہ یہ تصوّر ہمارے ذہنوں سے نکل جائے کہ ہم حاکم قوم Ruling nation کے افراد ہیں۔ ان کو خوف بھی ہے کہ اگر ان کی حکومتوں کے لیے کچھ مضر ثابت ہوگا تو مسلمانوں کا یہی جذبہ ہوگا کہ "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"۔ دیکھو میں نے انھی خیالات کے تحت یہ شعر کہا ہے ؎

نہ ہیں دین کے اور نہ ہیں دھن کے دشمن
فقط ہیں وہ اپنے میاں پن کے دشمن

اور سُنیے ؎

آپ اکبر لاکھ مشقِ خوش کلامی کیجیے — کتنا ہی اظہارِ اعزاز و دوامی کیجیے
دوستی کی آپ سے فرصت نہیں اس شوخ کو — یا کھسکیے سامنے سے یا غلامی کیجیے

مولوی عبدالماجد صاحب دریا بادی آئے ہوئے تھے۔ سیّد صاحب اُن کے ساتھ بیٹھے ہوئے گھوڑا گاڑی میں کٹرے سے گزر رہے تھے۔ راستے میں مجھے سائیکل پر جاتے دیکھ کر گاڑی روکی اور مجھے مولوی عبدالماجد صاحب سے متعارف کیا۔ شام کو میں عشرت منزل پہنچا تو مولوی عبدالماجد صاحب کسی سے ملنے کو باہر گئے ہوئے تھے۔ سیّد صاحب نے فرمایا: ہمارے فلاسفر صاحب اب تو ماشاء اللہ خدا کا منہ چڑھاتے چڑھاتے خدا والے ہونے والے ہیں۔ کہتے تھے کہ آج کل میں مولانا رومؒ کی مثنوی پڑھ رہا ہوں کہ دیکھوں اُنھوں نے فلسفہ اور عرفان کی راہیں کیوں کر طے کی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی پوچھے کیوں جی مجنوں کیسے روتا تھا۔ مخاطب کہے تم پوچھ کر کیا کروگے؟ جواب ملے کہ میں بھی ویسے ہی رونے کی عادت ڈالوں گا۔ بھلا اِس نقالی اور جذبہ خود نمائی سے کہیں دل میں اثر پیدا ہوتا ہے پہلے قلب میں مجنوں کا سا گداز پیدا کرو، اس کا سا رونا خود آجائے گا۔ مجنوں مجسم محبّت تھا اور آپ مجسم نفرت۔ زعمِ فلسفہ دانی میں مذہب کے متعلق اپنے عقائد کا اعلان کرکے پیش تر اسلامی دنیا کو دشمن بنا لیا۔ نفرت

سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور محبت سے محبت۔ تمام مسلمان متنفر ہو گئے
ہیں نے اسی کوفت میں یہ اشعار لکھے ہیں ؎

مسجد میں شیخ صاحب گرجا میں لاٹ صاحب
بُڈھو فلاسفی کے کمرے میں سٹر رہے ہیں
خاک اُڑ رہی ہے گھر میں ڈیوڑھی میں غل مچا ہے
مذہب کے ہیں مخالف بھائی سے لڑ رہے ہیں

خدا کرے مولانا رومؒ کی تعلیم اثر کرے اور الحاد سے ہٹ کر اسلام کی طرف آجائیں۔ دیکھو کیا اچھا شعر نکلا ہے ؎

مذہب میں پناہ آخر کو ملی اور کفر کی زد سے بچ نکلے
ہر دم ہے یہی اب اپنی دعا اللہ کا ہونا سچ نکلے

میں نے کہا: شعر کی شوخی دیکھنے کے قابل ہے۔ جب خدا کے وجود ہی میں شک ہے تو دعا کس سے مانگی جا رہی ہے۔ اس کے تیور آپ کے اس شعر سے ملتے ہیں ؎

منظور مجھے شکوۂ بیداد بتاں ہے — للہ بتا دو کوئی اللہ کہاں ہے

فرمایا: ناقص تعلیم اور بُرا ماحول لوگوں کو الحاد کی طرف لے جا رہا ہے، میں نے اسی پر کہا ہے ؎

یکے ذی علم در اسکول روزے — فتاد از جانب پبلک بدستم
بدو گفتم کہ کفری یا بلائی — کہ بیش اعتقادات تو پستم
بگفتا مسلم مقبول بودم — ولے یک عمر با ملحد نشستم
جمال[۱] نیچری در من اثر کرد — دگر نہ من ہماں شیخم کہ ہستم

---

[۱] یہاں حضرت شیخ سعدیؒ کے اس حمام والے قطعے کو اپنا بنایا ہے (دیکھیے صفحہ ۷۳)

میں نے عرض کیا کہ آپ نے الحاد کی وجہ ناقص تعلیم درست فرمائی۔

میرے ایک دوست حکیم محمد حسن صاحب کے چار مصرعے ہیں ؎

دانش سے کہا آئی ہے میرے دل میں جو لہر
کیوں دہریے ہو جاتے ہیں علامۂ دہر

کہنے لگے اک کشتۂ سیماب ہے علم
پکا ہو تو اکسیر ہے کچا ہو تو زہر

نان کو آپریشن کے تذکرے پر فرمایا دنیا ترقی کرے لیکن ہندستان اور بالخصوص ہندستان کی دیسی ریاستیں کسی طرح نہیں ابھر سکتیں۔ حکومت کا نظام کچھ ایسا ہے کہ حقیقی ترقی کی کسی طرف گنجایش ہی نظر نہیں آتی۔ یہ ہماری سمجھ کی غلطی ہے کہ ہم دیگر ممالک کے افراد کی طرح خود کو آزاد

(نوٹ صفحہ ۷۲)
جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

سید صاحب نے اسی طرح متعدد فارسی اشعار کو اپنی ظرافت و مصلحت کا جامہ پہنایا ہے۔ حضرت حافظ شیرازیؒ کا قطعہ ہے ؎

بلبلے برگ گلِ خوش رنگ در منقار داشت
و ندراں برگ و نوا خوش نالہائے زار داشت

گفتمش در عینِ وصل ایں نالہ و فریاد چیست؟
گفت مارا جلوۂ معشوق دریں کار داشت

حافظ کے اس قطعے کو اکبر نے یوں بدلا ہے ؎

بابوئے در دھوتیٔ زرد کہ زنار داشت
با وجودش نالہائے زار ور اخبار داشت

گفتمش در عینِ وصل ایں نالہ و فریاد چیست؟
گفت مارا خوفِ فیس و ٹیکس دریں کار داشت

بنگالی حضرات کی قلبی کیفیت کو کئی جگہ بے نقاب کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ غ

تیغ زباں کی دیکھو ہر سو برہنگی ہے
بابو کے حوصلے ہیں صاحب کی دل لگی ہے

(دیکھیے صفحہ ۷۴)

اور ترقی کرنے کا اہل سمجھتے ہیں۔ ہندستان برطانیہ کے معدے میں ہی اور دیسی ریاستیں تو اس معدے میں قریب قریب ہضم ہو چکی ہیں۔ پھر ہندستان کے افراد سے ترقی کی توقع ایک خیال ہی اور جنون۔ ہماری حالت اُس دانے کی سی ہی جس کو کسی جانور نے کھا لیا ہو اور معدے کے فعلِ ہضم کے اثر کے بعد وہ پھر جانور کے گوبر کے ساتھ خارج ہو گیا ہو۔ دوبارہ خشک ہو کر بظاہر ایسا دانہ ایک گیہوں ہی معلوم ہوتا ہی مگر یہ ایسا گیہوں ہی جس سے قوتِ نمو سلب ہو چکی ہی اگر اسے بویا جائے تو اُگے گا نہیں۔ اسی طرح ہماری شکل بظاہر انسانوں کی سی ہی مگر ہم سے باطنی جوہر اور عمل

(بقیہ صفحہ ۷۳)

بابو صاحب کا یہ ہی شکوۂ افلاس بجا　　　سچ تو کہتے ہیں کہ مچھلی نہ سہی بھات تو ہو

قولِ بابو ہی کہ جب بل پیش ہو　　　پیشِ حاکم بلبلانا چاہیے

بابو صاحب نے کہا اک باغ ہی میرا کلام　　　اس میں کیا شک ہی مگر یہ باغ شالا مار ہی

"شالا مار" پنجاب میں ایک مشہور باغ کا نام ہی اور بنگالی بابو سالا کو شالا کہتے ہیں۔

ہمیں بھگوان کی کرپا نے تو بابو بنایا ہی
مگر یورپ کے شالا لوگ نے اُلّو بنایا ہی

سید صاحب نے حضرت مولانا رومؒ کے اس شعر پر ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست　　　می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

اکبری روغن یوں چڑھایا ہی ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ پیٹ　　　می برد ہر جا کہ میز است و پلیٹ

کے ولولے مفقود ہو چکے ہیں۔ میں نے اسی خیال کو یوں ظاہر کیا ہے ؎

دانے کو ہے حقِ نشو و نما اس سے تو نہیں انکار اکبر
لیکن یہ بتاؤ تو مجھ کو وہ کھیت میں ہے یا پیٹ میں ہے

فرمایا ۱۹۱۸ء کے قحط سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا تھا ؎

سچ تو ہے گردوں سے راہِ مہربانی کیوں ملے
آگ جب یورپ میں برسے ہم کو پانی کیوں ملے

فرمایا . . . صاحب نے ایک پارسی لڑکی کو بیوی بنا لیا۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ پارسی اہلِ کتاب میں شامل ہیں یا نہیں۔ یہ لڑکی اگر پارسی مذہب پہ قائم رہے اور میں اسلام پر، تو ایسے تعلقاتِ زن و شوئی قائم رکھنے میں اعتراضات تو نہ ہوں گے یا یہ صورت ہونی چاہیے کہ اس کے دائرۂ اسلام میں آ جانے کا اعلان کیا جائے۔ بہرحال ایک پارسی لڑکی سے مواصلتِ مستقل کی خواہش نے اب توجیہات تلاش کیں۔ انسان ایک فعل نفس کے تقاضے سے کر بیٹھتا ہے، پھر اس کے جواز کی دلیل اور تاویل مذہب و قانون میں تلاش کرتا ہے۔ اس خیال نے مجھ سے یہ شعر لکھوایا ؎ غ

پہلے ہوتی ہے حسرتِ زن پیدا | پھر بعد اس کے ہے بحثِ نیشن پیدا

افسوس ؎

کہاں ہم میں جماعت اور طاعت | شکستہ ہو گئے سابق کے رشتے
نہیں ہے کچھ شکایت لیڈروں کی | کہ جیسی روح ہے ویسے فرشتے

اور سنو ؎

ممبرِ لیگم صفتِ مسجد مرا درکار نیست | جان بہمہ ہو چکا ہے حاجتِ غم خوار نیست
مفتیِ شرع نہ ہوں لیڈرِ اسلام تو ہیں | بوئے مسجد نہ سہی کیمپ کے گلفام تو ہیں

فرمایا: ایک دن ایک مسلمان گریجویٹ تشریف لائے۔ ان کی لیاقت تاریخی واقفیت اور گفتگو سے بہت جی خوش ہوا۔ اتنے میں حافظ صاحب نے مغرب کی اذان دی۔ اذان سنتے ہی یہ صاحب بولے: اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ سب لوگ مصلّے کی طرف بڑھے اور وہ صاحب دروازے کی طرف۔ میں حیرت میں رہ گیا کہ قال اور حال میں اتنا فرق ہے۔ میں نے اس پر کہا ہے ؎

دل میں خاک اڑتی ہے خالی لبچہ ولب دیکھیے
مذہب اب رخصت ہے بس تاریخ مذہب دیکھیے

ایک دن حاضر ہوا تو بڑے غصّے میں تھے۔ فرمایا آپ نے دیکھا میرے کلام پر بلیا کی ایک لڑکی خاتون اکرم کی طرف سے اعتراض شایع ہوے ہیں کہ میری شاعری طبقۂ نسواں کو قعر پستی و مذلت میں گرانے والی ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اس لڑکی کے پردے میں کوئی مرد ہے۔ یہ مضمون لکھا کسی مرد نے ہے اور چھپوایا ہے ایک عورت کے نام سے۔ مردوں میں اتنی ہمّت باقی نہ رہی کہ سامنے آکر مقابلہ کریں۔ ایک لڑکی کو رڈو برڈو کر دیا کہ تو بڑھ کے گالی کو سنے دے اسی خیال سے جل کر میں نے کہا ہے ؎

حمایت میں نے پردے کی تو کی تھی خوش مزاجی سے
مجھے دلوا رہے ہیں گالیاں وہ اپنی باجی سے[1]

---

[1] ملاحظہ ہوں خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامی صاحب جن میں لکھا ہے "مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ اکرم و آصف جہاں کی تردید کرنے کو اکثر اخبار آمادہ ہو گئے ہیں۔ مگر میں اس کو فضول سمجھتا ہوں۔ ہیں تو آصف جہاں صاحبہ سے صلح کرنے پر آمادہ ہوں کہ رباعی صفحہ ،، پر

فرمایا: اسی طرح اڈیٹر تہذیبِ نسواں نے لکھ مارا کہ کاش اکبر کا قلم پردے کی مخالفت اور زمانے کے تقاضے کی موافقت میں اٹھتا۔ میں نے اس کا جواب دیا ہے ؎

اس بزم میں مجھے کہتے ہیں وہ موقع کے موافق بات کرو
اور ہم نے یہ دل میں ٹھانی ہے یا دل کی کہیں یا کچھ نہ کہیں

فرمایا: ڈاکٹر اقبال نے تصوّف اور حضرت حافظ شیرازیؒ پر جو اعتراضات کیے ہیں اُن سے مجھے رنج ہوا اور یہ شعر نکل گئے ؎

مولوی ہو ہی چکے تھے نذرِ کالج اس سے قبل
خانقاہیں رہ گئی تھیں اب ہے ان کا انہدام
لکچر مضمون لکھتے ہیں تصوّف کے خلاف
الوداع اے ذوقِ باطن الوداع اے فیضِ عام

اقبال کی یہ تحقیق کہ حافظؒ کی شرابِ عرفان حقیقت میں انگور اور مہوے کی شراب تھی، بذاتِ خود کسی معجونِ فلک سیر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے ؎

نیا ڈھالتے ہیں وہ حکمت کے باغ کی
دھسکی سے ہو رہی ہے صفائی دماغ کی

فرمایا: بعض اہلِ ہند حکومت کے اشارے سے کچھ خیالات پیش کرتے ہیں اور ظاہر کرتے ہیں کہ یہ خیالات ان کے طبع زاد ہیں۔ میں ان لوگوں کو اس بلند خیالی کی داد نہیں دیتا۔ میں ان کے معلّمین کو مبارک باد دیتا ہوں ؎

بوزنہ کو رقص پر کس بات کی میں داد دوں
ہاں یہ جائز ہے مداری کو مبارک باد دوں

(بقیہ نوٹ صفحہ ۷۶) جب تک آپ کا شباب ہے میں اپنی نظموں کو واپس لیتا ہوں۔

ناچنے والے کو نہ دیکھو، یہ دیکھو نچانے والے نے نچایا کیسا۔ افسوس ہے

بے بصر وہ ہیں جو جنت میں یہاں خرسند ہیں
جن کی آنکھیں کھل گئیں ان کی زبانیں بند ہیں

فرمایا: میں نے اپنی آنکھ کا اپریشن کرایا تھا تو ڈاکٹر نے پٹی کھولنے کے بعد تاکید کردی تھی کہ کوئی بات نہ کی جائے ورنہ آنکھیں متحرک و متاثر ہوں گی اس موقع پر یہ شعر کہا تھا۔ فرمایا مجھے سرسید اور شیخ عبداللہ صاحب بانی نسواں کالج علی گڑھ کا خیال آیا اس سلسلے یہ شعر نکل گئے ہے

کالج بنا عمارتِ فخر النسا بنی	شکرِ خدا کہ ل گئے آخر بنا بنی
اک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو ابھارا	اک پیر نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا
وہ تن گیا پتلون میں یہ ساہیں پھیلی	پیجامہ غرض یہ ہے کہ دونوں نے اتارا

میں نے عرض کیا: اب تک میں آپ کے یہ اشعار مخرب اخلاق سمجھتا تھا ہے

شرما دیا ہر اک کو یورپ نے پاس کرکے	سید بھی کورے کھسکے برسوں مساس کرکے
کاش کرے مجھے وہ شاہد ہوٹل منظور	کیک تو روز ہے ایک رات تنہن بھی سہی

لیکن اس پتلون والے قطعے میں تو آپ بالکل عریانی پر اتر آئے۔ فرمایا، ہاں، دنیا میں اس کی بھی ضرورت ہے جیسا مخاطب ہو اس سے ویسی ہی بات کرنی چاہیے۔ آپ میرا یہ شعر سنیں گے تو کیا کہیں گے ہے غ

مجھی پر کہ لکچر صاحب کی برقا وعظ گرتی ہے
بپھرتے ہیں فقط فرہاد پر حسرت ... تی ہے

میں نے عرض کیا لاحول ولاقوۃ۔ آپ تو کھل کھل کر گالیاں بکنے لگے۔ بازاری شہدوں کے واسطے کچھ تو زبان چھوڑیے۔ بگڑ کر فرمایا، اچھا اخلاقیات پر اپنا وعظ ختم فرمائیے۔ میرے شعر کی قوت دیکھیے اور بس۔ فرمایا بعض مقررین و

اخبار موقع اور وقت نہیں دیکھتے۔ پبلک کی واہ واہ کے مغالطے میں بے تکان زبان کھولتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تھوڑے عرصے تک بھی خدمت نہیں کرنے پاتے کہ ضمانت ضبط ہو جاتی ہے اور زبان بندی کر دی جاتی ہے میں نے اس پر کہا ہے ؎

دسمبر میں وہ دوڑے بے تحاشا
لگا ہونے ترقی کا تماشا
زباں گنجینۂ لفظی میں لکھ لٹ
چلی اسپیچ کے میداں میں بگ ٹٹ
ہوئی جب جنوری رو کڑ کی طالب
رپٹ لکھوا گیا قومی محاسب

فرمایا ۱۹۱۳ء میں "الہلال" کی ضمانت ضبط ہوئی اور اس کی زندگی ختم ہوتی معلوم ہوئی تو کہا تھا ؎

مغرب کی برق ٹوٹ پڑی اس غریب پر
دورِ فلک ہلال کو لایا صلیب پر

پرچہ "توحید" ضبط ہوا تھا، اس پر کہا تھا ؎

ضبطیِ پرچۂ "توحید" ہوئی فیریہ ہے
قل ہو اللہ احد ضبط نہیں خیریہ ہے

اخبار "ہمدم" لکھنؤ کے نکلنے پر کہا تھا ؎

خوب ہے نام اس کا گر ہمدم رہے
دم نکلنے پر بھی باقی ہم رہے

رسالہ "نقیب" بدایوں کے نکلنے پر کہا تھا ؎

نرغہ ہو جو قلب پہ فوجِ رقیب کا
نکلا مقابلے کو رسالہ نقیب کا

فرمایا: اس خیال کو کہ دیسیوں کے مقابلے میں بدیسیوں سے سازباز

کرنا ملک کے لیے سخت مضر ہو، یوں ظاہر کیا ہے ؎

دھن دیس کی تھی جس میں گاناتھا اک دہاتی
بسکٹ سے ہو ملائم پوری ہو یا چپاتی

اونٹ (مسلمان) نے گایوں (ہندو) کی ضد پر شیر کو ساجھی کیا

پھر تو مینڈھے سے بھی بدتر سب نے پایا اونٹ کو
جس پہ رکھا چاہتے ہو باقی اپنی دسترس
منہ میں ہاتھی کے کبھی اے بھائی وہ گنا نہ دو

فرمایا جب مسٹن صاحب کی دلچسپی کے باعث لکھنو میں شیعہ کالج کی بنیاد پڑی تو ایک شیعہ صاحب نے مجھ سے کہا کہ یہ کالج علی گڑھ کالج کے مقابلے میں قائم کیا جا رہا ہے، سرسید کی درس گاہ کو اس سے نقصان پہنچے گا میں نے اس پر اُن سے کہا کہ سرسیّد کا مشن توسیع علم تھا۔ وہ غرض لکھنؤ میں اس کالج کے قیام سے اور پوری ہوگی۔ کالج میں مختلف علوم سکھائے جاتے ہیں، نرا مذہب نہیں سکھایا جاتا۔ خالص مذہب سکھانا امام باڑے کا کام ہے۔ اگر لکھنؤ میں کوئی نیا امام باڑہ قائم ہوتا تو خیال ہوتا کہ سنّی شیعہ لوگوں کے قلب کو ایک دوسرے سے بعید کرنے میں ایک خلیج اور حائل ہوگئی۔ اس لیے شیعہ کالج کے قیام سے سرسیّد یا اُن کے گروہ کے لوگوں کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں نے اس پر کہا تھا ؎ غ

سید صاحب کو عذر کیوں ہونے لگا
کالج ہے یہ کچھ امام باڑہ تو نہیں

اگر کالج سے خالص امام باڑے کا کام لیا جانے والا ہے تو اس کی دوسری

بات ہے۔ فرمایا: اقبال کی مثنوی کا یورپ میں ترجمہ ہؤا اور اس کی بہت داد دی گئی۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ فارسی زبان ایشائی فلسفہ اور عرفان اور اس کے یورپین قدردان، اس پر اقبال صاحب شاداں وفرحاں۔ اگر اہلِ ایران جو اہلِ زبان ہیں داد دیتے تو ایک امتیازی بات بھی تھی۔ میں اس یورپین ترجمے اور داد کو ہرگز قابلِ افتخار نہیں سمجھتا۔ میں نے اسی پر کہا ہے ؎

رقیب سرٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم
یہی ہے عشق تو اب ترکِ عاشقی اولے

فرمایا: انسان کی عزّت کے متعلق اب دنیا کا معیار بالکل الٹا ہو گیا ؎

نہیں کچھ اس کی پرسش الفت اللہ کتنی ہے؟
یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے؟

میں نے کہا: سچ فرماتے ہیں میرے ایک دوست نعمانی صاحب ایک سادہ وضع مسلمان ہیں اور حیدرآباد میں گزیٹڈ عہدہ دار۔ وہ ایک دن اپنی بیتی بیان فرما رہے تھے۔ کہتے تھے ریل میں ایک صاحب اندر آنے میں سخت مزاحم ہوئے، بہ دشواری میں ڈبے میں گھس کر کھڑا ہو گیا۔ ریل چلنے لگی۔ معترض صاحب کے غصّے کا پارہ اونچا ہو گیا۔ کہنے لگے: آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ جگہ نہیں ہے مگر جنگلی لوگ بھیڑ چال مخلوق گھسے چلے آرہے ہیں۔ کہاں تک جاؤ گے؟ میں نے کہا حیدرآباد تک۔ بولے: ماشاءاللہ اتنا لمبا سفر! ابھی آپ کو جان دینے کو کوئی اور ڈبہ نہ تھا؟ میں نے نرمی سے کہا کہ آپ کیوں اتنے برہم ہو رہے ہیں؟ میں آپ پر بار نہیں ہوں۔ ایک کونے میں کھڑا ہوں۔ یہ سن کر بھر کچھ بڑبڑاتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد پھر پوچھا: کیا حیدرآباد میں نوکر ہو؟ میں نے کہا: ہاں۔ پوچھا: کتنے کے؟ میں نے

کہا: آپ پوچھ کر کیا کریں گے؟ ضرورت سے زیادہ مل جاتا ہے۔ بولے: کوئی تیس چالیس روپے ماہوار پاتے ہوگے؟ میں نے کہا: خدا اس سے زیادہ دیتا ہے۔ بولے: تو کیا ستر تا سو کے گریڈ میں ہو؟ میں نے کہا: اللہ کا احسان ہے کہ وہ آپ کی اور میری دونوں کی توقعات سے زیادہ دیتا ہے۔ بولے تو شاید آپ کو ڈیڑھ سو تا دو سو کا گریڈ ملتا ہے۔ میں نے کہا: ہاں ابتدا میں یہی گریڈ تھا، اب ترقی ہوگئی ہے۔ بولے تو پھر یہ کیوں نہیں فرماتے کہ آپ دو سو سے اوپر کے گزیٹڈ گریڈ میں ہیں۔ میں نے کہا: ہاں کہنے لگے اس طرف دھوپ آرہی ہے، آپ میرے قریب اس سیٹ پر آجائیے۔ آپ سے اچھی ملاقات ہوگئی۔ میں نے سنا ہے حیدرآباد میں کوئی تعلیمی سند نہ رکھنے والوں کو ریلوے اور پولیس میں اب بھی اچھی نوکریاں مل جاتی ہیں۔ میرا ایک بھتیجا ہے، میٹرک میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس کے متعلق آپ سے مشورہ کرنا ہے۔ اپنے اس شعر کی یہ وضاحت سن کر سید صاحب خوب ہنسے۔ فرمایا: ابھی خود مجھ پر یہی گزری ہے۔ میں عشرت حسین کے پاس گیا۔ عشرت ڈپٹی کلکٹر ٹھیرے۔ شام کو وکلا و احباب وغیرہ جمع ہو جاتے تھے۔ میں اندر سے نکل کر باہر آیا تو لوگ جمع تھے۔ ان میں میرے ایک شناسا بھی تھے۔ انھوں نے چونک کر مجھ سے پوچھا: میر صاحب آپ کب آئے؟ میں نے جواب دیا۔ انھوں نے میرا تعارف موجودہ لوگوں سے کرایا کہ آپ خان بہادر سید اکبر حسین صاحب ہیں۔ لوگوں نے لاپروائی سے گردنیں ہلائیں۔ شناسا صاحب نے پھر کہا۔ آپ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو ہیں اور جج رہ چکے ہیں۔ اب پنشن لے لی ہے۔ مجمع نے پھر ایک نمایشی مسرت کا اظہار کرکے کہا کہ بجا ہے بجا ہے۔ آخر میں میرے دوست نے کہا آپ

ڈپٹی عشرت حسین صاحب کے والد ہیں۔اتنا سننا تھا کہ مجمع میں سے متعدد اصحاب آہا آہا کہتے ہوے بے تحاشا دست بوسی کے لیے میری طرف بڑھے۔ اُن کے اس نظریے سے میرے دل پر چوٹ لگی۔مگر میں نے بھی گھن مارا۔ میں نے اپنے دوست سے مخاطب ہوکر کہا کہ بھائی میں نے آج عجیب خواب دیکھا۔کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ بلند مرتبت ریش دراز پادری جمع ہیں۔عبادت و ریاضت کے آثار ان کے چہرے سے ظاہر ہیں۔اس مجمع میں ایک بزرگ تشریف لائے۔تمام پادری صاحبان ایک استغراقی کیفیت میں تھے متوجہ نہ ہوے۔ ایک صاحب نے توجہ کی اور پہچان کر دوسرے پادریوں سے کہا کہ آپ سے ملیے خدائے قدوس آپ ہی ہیں۔پادریوں نے بے پروائی سے گردنیں ہلائیں۔ متعارف کرنے والے نے پھر کہا۔ حی و قیوم اور حافظِ حقیقی آپ ہی کی ذات ہے۔ اس پر بھی پادری صاحبان متوجہ نہ ہوے۔آخر میں شناسا نے کہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باپ آپ ہی ہیں تو مجمع چونک پڑا اور خدا کے سامنے سجدے میں گر پڑا۔ فرمایا زر کی قدر اور دیکھو ؎

اکبر نے کہا سن لو یارو اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

مگر زر کی طاقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔میں خود کہتا ہوں ؎

بے سود اشعار اور کبت ہوتے ہیں مفلس سے کہاں وہ ملتفت ہوتے ہیں
کر پیچ تو عشق کے اکھاڑے میں ہزار یہ بت تو بزور زر ہی جیت ہوتے ہیں

میں نے عرض کیا:آغا شاعر قزلباش کا بھی یہی خیال ہے ؎

آؤ اس بت کو رُخِ زرد دکھائیں شاعر نرم کر دیتا ہے فولاد کو زر کا ٹکڑا

۱۱ ستمبر ۱۹۱۹ء کو عشرت منزل پہنچا۔ سید صاحب کئی دن سے بیمار تھے، جگر کی خرابی کی شکایت تھی۔ غذا نہ ہضم ہونے کے باعث بہت ناتواں ہوگئے تھے۔ میں نے مزاج پوچھا فرمایا: ضعف بہت ہے ؎

اگر کچھ زندگی باقی ہے اچھا ہو ہی جاؤں گا
وگرنہ جس طرح سب سوگئے ہیں سو ہی جاؤں گا

ضعف پر خیال آیا۔ میر تقی فرماتے ہیں ؎

آہ جو ہمدمی سے کرتی ہے — آج وہ بھی کمی سی کرتی ہے

میں نے عرض کیا: میرے ماموں تولا حسین صاحب کا شعر ہے ؎

وہ آہ رات دن کی جو اک سہل بات تھی
اُس کام کو بھی ضعف نے مشکل بنا دیا

۱۳ ستمبر ۱۹۱۹ء کو فرمایا: ایک صاحب نے جگر کے لیے اونٹنی کا دودھ پینے کو بتایا ہے۔ آپ کو اگر کہیں مل سکے تو تلاش کیجیے۔ اس بڑھاپے میں جگر کی خرابی پھر شیر خوار بنا رہی ہے، ماں باپ نے بچپن ہی میں غلطی کی اگر کسی دراز قامت انّا کا دودھ پلوا دیتے تو آج اونٹنی کی تلاش کیوں ہوتی۔

فرمایا: ڈاکٹر اقبال نے تصوف کے خلاف جو ہنگامہ برپا کردیا ہے اس پر میں نے کہا ہے ؎

تقلیدِ غرب و ترکِ عبادت پہ ہیں خموش
لے بیٹھے ہیں وہ صوفیٔ خانہ خراب کو

افسوس ؎

قرآن سمجھ لیں گے ذرا پاس تو ہولیں
والنّاس بھی دیکھیں گے ذرا ناس تو ہولیں

دیکھو کسی ایرانی نے کیا خوب کہا ہے ؎

نہ خیالِ حور و غلماں نہ سرِ بہشت مارا　　دلِ ما فدا ے دستے کہ چنیں سرشت مارا

۱۴ ر ستمبر ۱۹۱۹ء

فرمایا: عشرت حسین کے لڑکے عقیل نے آج بڑی ذہانت کا ثبوت دیا۔ میں نے ایک مصرع موزوں کیا تھا۔ ؏

"تم ترکِ موالات کرو ریل نہ چھوڑو"

اس پر اس نے کیا برجستہ مصرع لگایا ہے۔ میں نے کہا کیا۔ فرمایا: وہ خود سنائے گا۔ اس نے سنایا۔ ؏

صاحب سے ہو بیزار مگر میل نہ چھوڑو

میں نے اس لڑکے کو پیار کیا اور ایک رُپیہ انعام دیا۔ وہ لینے میں پس و پیش کرنے لگا۔ فرمایا لے لو یہ ہمارے مخصوص دستوں میں سے ہیں۔ اس نے لے لیا۔ اس واقعے سے قبل کئی مرتبہ ایسا ہوچکا کہ سید صاحب نے کسی مضمون کا ذکر کر کے لوگوں کو کوئی شعر سنانا چاہا لیکن ان کے سوچنے سے قبل میں نے وہ شعر پڑھ دیا یا کسی نئے شعر کا دوسرا مصرع پڑھنے سے پہلے قافیہ بتا دیا اس پر میری تعریف کرتے تھے اور داد دیتے رہتے تھے کہ ماشاءاللہ آپ کا ذہن اور حافظہ کیسا تیز ہے لیکن عقیل کو جب سے میں نے رُپیہ دیا اس کے بعد کئی مرتبہ لوگوں کے سامنے کہہ چکے تھے ماشاءاللہ آپ نے خوب یاد رکھا۔ آپ کا ایک رُپیہ انعام مجھ پر واجب ہوا۔ ایک دن سید مقبول احمد صاحب سررشتہ دار کمشنری موجود تھے۔ اُن کے سامنے میری نشان دہی پر داد دیتے ہوئے فرمانے لگے کہ ماشاءاللہ ماشاءاللہ آپ کا ایک رُپیہ انعام ہوا۔

مقبول احمد صاحب مجھ سے بعد کو دریافت کرنے لگے کہ کیا سید صاحب
آپ کو داد بہ شکل کیش دیا کرتے ہیں۔ میں نے کہا توبہ کیجیے۔ اعلانِ نقدی
سے وہ اپنے نزدیک میرا دل خوش کرتے ہیں مگر مجھے بڑی کوفت ہوتی
ہی۔ انھوں نے کہا ہر کس و ناکس کے سامنے ایسا اظہار اچھا نہیں ہی۔
اس کو کسی صورت سے بند کرنا چاہیے۔ میں نے کہا کیا کروں۔ بولے اب
اگر کہیں کہ آپ کا ایک رُپیہ انعام ہوا تو سابقہ انعامات کا حساب
سمجھا کر کہیے کہ اب تک میرے اتنے رُپے پا فلتنی ہیں۔ واقعی یہ نسخہ نہایت
مجرب ثابت ہوا۔ میرے رقم مجموعی کے یاد دلانے کے بعد سے نقدی کے
اعلان کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

۱۸ رستمبر ۱۹۱۹ء

فرمایا شکسپیر کا کلام دیکھا ہی اس کا یہ مصرع یاد ہوگا:

Dust thou art, to dust returneth

اب میرا ایک مطلع سُنیے ؎

باغِ عالم میں نظر نم ناک ہو کر رہ گئی
رنگ بدلے خاک نے پھر خاک ہو کر رہ گئی

میں نے بہت داد دی۔ فرمایا: دوسرا شعر سُنو ؎

جاتی ہی اسکول میں لڑکی کہ کچھ حاصل کرے
کیا ہوا حاصل جو بس بے باک ہو کر رہ گئی

فرمایا: دیکھو کتنے مشکل قوافی میں کیسا صاف شعر نکلا ہی۔ ہوم رولیوں اور
حکومت کے خیال کا فرق واضح کیا ہی ؎

امید نے تو کھڑی کی ہیں خوب دیواریں ۔۔۔ زمانہ کہتا ہی یہ چھت کبھی پٹے گی نہیں

فرمایا: یورپین سیاست میدانِ جنگ اور مکاتب دونوں سے یکساں مفید مطلب کام لیتی ہے۔ اہلِ یورپ پہلے جنگ کے تمام شدائد پورے کرکے زیر کرتے ہیں اس کے بعد مفتوحہ ملک میں اپنے مدارس جاری کرکے قلوب کو اپنے رنگ پر لاتے ہیں۔ اس خیال کو میں نے یوں ادا کیا ہے ؎

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے　　　جب بسولہ ہٹا تو رندا ہے

میں نے کہا دونوں مصرعوں کا وزن مختلف ہے۔ بولے: کیسے؟ میں نے کہا پہلے مصرع کی تقطیع یہ ہوگی "فاعلاتن فعلاتن فعلن" دوسرے مصرع کا وزن ہے "فاعلاتن مفاعلن فعلن"

توپ کھسکی فاعلاتن پروفیسر فعلاتن پہنچے فعلن
جب بسولہ فاعلاتن ہٹا تو رن مفاعلن دا ہے فعلن

یا پہلے مصرعے میں پروفیسر کی بجائے پروفسر کہنا پڑے گا جو غلط ہے۔ بولے ماشاءاللہ ماشاءاللہ کیسی صحیح نظر پہنچی۔ درست کردوں گا۔ فرمایا ناخدائے سخن جناب نوح ناروی صاحب آئے ہوئے تھے۔ میں نے اُن کو بھی شعر سنایا تشبیہ کی ندرت پر واہ واہ، واہ واہ کرتے رہے اور اس عروضی سقم پر نہ ٹوکا۔ میں تو پیرانہ سالی اور امراض سے ویسے ہی حواس باختہ ہوں۔

فرمایا: حصۂ سوم کی ترتیب ۲۸ ستمبر سے شروع فرما دیجیے[1]

۲۵ ستمبر ۱۹۱۹ء

بتاریخ ۲۳ ستمبر ۱۹۱۹ء مجھ کو ایک لوکل کارڈ کے ذریعے اطلاع دی تھی "خواجہ حسن نظامی صاحب آج تشریف لا رہے ہیں اطلاعاً لکھتا ہوں شاید دو چار روز رہیں۔" حسبِ اطلاع گیا۔ مزاج پرسی کی۔ فرمایا ؎

---

[1] مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس مصرع کو درست کرلے کا خیال نہیں رہا اس لیے حصۂ سوم میں اسی طرح چھپا ہے۔

کمزور ہی میری صحت بھی کمزور مری بیماری بھی
زندہ جو رہا کچھ کر نہ کر سکا بیمار پڑا تو مر نہ سکا

معلوم ہوا خواجہ صاحب تشریف نہیں لائے۔ میرے ساتھ مولوی محمد محسن صاحب صدیقی بی۔اے (علیگ) بھی تھے جو اس زمانے میں حیدر آباد اکاؤنٹنٹی سے الہ آباد میں کارآموزی کے واسطے روانہ کیے گئے تھے اور اب فینانس میں مددگار ہیں۔ کچھ رسم الخط کا تذکرہ نکلا۔ مولوی محمد محسن صاحب نے فرمایا کہ ہمارے ہاتھ کے جوڑوں کی فطری ساخت ایسی ہو کہ تحریر دستِ چپ سے دستِ راست کی طرف لائیں تو جنبشِ قلم میں تکلف نہیں ہوتا۔ سید اکبر حسین صاحب نے اس ریمارک پر فرمایا ماشاء اللہ کیا کہنا اس پر ہم بھی صاد کرتے ہیں کہ انگریزی زبان پُر تکلف ہوتی ہو۔ جرمنی کے ہتھیار ڈال دینے کے تذکرے پر فرمایا: اجی ایسا معلوم ہوتا ہو کہ انگریزی ٹوٹکوں سے جرمنی کو سکتہ ہو گیا ہو۔ انگریزی پالیسی اور ترکیبوں کا کیا کہنا ؎ غ

برخلاف انگلش کے یہ یورپ میں بکتا کون ہو
جب سے ہم ہارے ہیں اس سے جیت سکتا کون ہو

فرمایا:۔ افغانستان پر گولہ باری کے سلسلے میں اس شعر کو میں نے اہلِ افغانستان کی زبان سے ادا کیا ہو ؎ غ

ایرشپ سے ہم پناہ اے چرخ پائیں گے کہاں
آسمان بولا کہ ہم سے اڑ کے جائیں گے کہاں

فرمایا ؎

جو ایرشپ پر چڑھے تو ایسے کہ بس ہمیں ہیں خدا نہیں ہو

جو ایر شب سے گرے تو ایسے کہ لاش کا بھی پتا نہیں ہے

۱۱ر اکتوبر ۱۹۱۹ء

میں نے حصۂ سوم کی ترتیب ۲۸ر ستمبر سے شروع کر دی تھی جب اس شعر پر پہنچا ؎

خنجر کی چمک بھی چھُپ نہ سکی فریاد بھی میری سب نے سنی
دامن نہ سمیٹ اب اے قاتل دیکھ اس میں لہو تو بھر بھی گیا

تو میں نے کہا کہ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ بندش بھی بہت ڈھیلی ہے۔ میرے ماموں صاحب فرماتے ہیں ؎

لہو بھی رنگ میں اپنے گریباں کو چھپا بیٹھا
چھپایا جب لہو سینے کے زخموں کا گریباں سے

پاس آئے تھے تو دامن کو بچائے رہتے تم یہ سمجھے کہ سمجھ ٹھیک ہے دیوانوں کی

کسی اور کا شعر ہے ؎

کہیں الزامِ گستاخی نہ دو خونِ شہیداں کو
لہو مقتل میں بہتا ہے سمیٹو اپنے داماں کو

فرمایا: ہاں، سچ ہے شعر کمزور ہے خارج کر دو۔ اور یہ شعر حصۂ سوم سے خارج کر دیا گیا۔

فرمایا: اہلِ یورپ نے ہمیں سیاست میں الجھا کر مذہب سے بیگانہ کر دیا۔ خود پر اعتراض کرنا اس لیے سکھایا کہ معترض کم از کم اتنی ہی دیر کے لیے یادِ خدا سے غافل ہو جائے۔ اس خیال کو میں نے یوں ادا کیا ہے ؎

نئی ترکیب یہ شیطان کو سوجھی ہے اغوا کی
خدا کی حمد کیجیے ترک بس مجھ کو برا کہیے

فرمایا: جو لوگ فرائض کو ترک کرکے غضبِ خداوندی سے نہیں ڈرتے اور اولادِ رسول کے غم میں سال میں ایک مرتبہ رو لینا نجات کے لیے کافی سمجھ لیتے ہیں اُن پر طعن کی ہے ؎ غ

غمِ حسین میں رونا ثواب ہے لیکن　　خدا کے خوف سے رونا بھی کچھ گناہ نہیں

فرمایا: رسمی رونے اور ناز و انداز کے اظہارِ غم پر یوں چٹکی لی ہے ؎ غ

یہ نخرا یہ لچک یہ جھانولی ہے کس طریقے میں
کہا سچ کہنے والے نے یہ مذہب بیگماتی ہے

میں نے عرض کیا: آپ کو کہنے کا بھی کیا ڈھنگ معلوم ہے۔ بظاہر کچھ نہیں کہتے لیکن سب کچھ کہہ گئے۔ بہت خوش ہوئے۔ فرمایا رسمی گریہ و بکا اور سینہ کوبی پر اور اعتراض دیکھو ؎

غم سے عبرت کا نور حاصل ہے　　غم نہایت مجلّیٔ دل ہے
غم سے مطلب وہ غم جو داغ بنے　　نہ وہ جو رسم کا چراغ بنے

میں نے عرض کیا سید مرزا صاحب تعشّق لکھنوی کا گریۂ پُرخلوص دیکھیے، فرماتے ہیں ؎

کور ہو جاؤں مگر عشق میں رونے کو نہ روک
ناصحا! دل سے زیادہ نہیں پیاری آنکھیں

میر انیس مرحوم نے بھی رونے کا فلسفہ خوب بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

رونے سے جو بہرہ مند ہوں گی آنکھیں　　خالق کو وہی پسند ہوں گی آنکھیں
ہے عین یقیں کہ آنسوؤں کا عقدہ　　کھل جائے گا سب جو بند ہوں گی آنکھیں

فرمایا جو شیعہ محض قال کے شیعہ ہیں حال کے نہیں، ان کی کمزوری میں نے یوں طشت از بام کی ہے ؎ غ

یہ چاہیے کہ بزرگوں کے ہوں صفات پرست
بنے ہو شوقِ جماعت میں صرف ذات پرست
اگرچہ ذکرِ شہادت پہ جان دیتے ہیں
جو دیکھیے تو ہیں آرام جو، حیات پرست

فرمایا: دیکھو تبرا کہنا اس ترکیب سے ترک کراتا ہوں۔ سمجھتا ہوں کہ تمھارے خیال میں جن لوگوں نے منشاے خدا و رسول کے خلاف اولادِ رسول کے حقوق کا اتلاف کیا ہے، ان کی سزا جہنم ہے۔ اگر خدا نے انھیں جہنم میں ڈالا ہے تو تمھارا ان کو دوزخ کے کنارے کھڑے ہوکر گالی گفتار کرنا بالکل ایک احمقانہ اور لایعنی فعل ہے۔ ایسے مبتلاے عذاب کو تمھاری گالی کیا تکلیف پہنچا سکتی ہے۔ اگر غیر مستحق کو گالی دیتے ہو تو مظلمہ اور عذابِ خداوندی کے لیے تیار رہو، اس مفہوم کو یوں ادا کرتا ہوں ؎ غ

اپنے سر زحمتِ بے سود یہ کیوں لیتے ہو
جو جہنم میں ہیں گالی انھیں کیوں دیتے ہو

فرمایا: بعض لوگوں کے نزدیک مذہب میں تبرا ایسا ہی ہے جیسے طب میں پرہیز۔ میں نے یہ شعر تعزیہ، مہندی، علم اور تخت وغیرہ کے نمایشی جلوس پر کہا ہے ؎ غ

کارِ دیں اور ہے دنیا کی خرافات ہے اور
بدتمیزی جو کرے خلق تو وہ بات ہے اور

فرمایا: آپ نے مجھے ایک دن کہا کہ بڈھا تعزیہ نکل رہا ہے چل کر دیکھ لیجیے۔

مگر میں نے انکار کر دیا۔ مجھے ان جلوسوں کے ساتھ انتظامی پولیس کی مسلح جماعت دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام آج بھی فوج کی حراست میں جا رہے ہیں۔ ہائے۔ غ

پہلے سنتے تھے صدائیں مردِ میداں کون ہے
اب تو یہ سرگوشیاں ہیں میری گویاں کون ہے

فرمایا: آپ دُوری کے باعث یہاں زیادہ نہیں آسکتے اس لیے میں نے سوچا کہ اپنے کٹرے والے بنگلے میں قیام اختیار کروں۔ میں نے عرض کیا میرے مکان سے وہ بھی ایسا قریب نہیں ہے۔ پھر فرمایا کیا کروں۔ اپنے مکان کے قریب کوئی کرایہ کا مکان تلاش کیجیے کہ آپ میرے پاس زیادہ سے زیادہ اکٹھ بیٹھ سکیں۔ فرمایا: حکیم اجمل خاں صاحب کا خط آیا ہے کچھ غیر مطبوعہ کلام طلب کرتے ہیں، کچھ روانہ کر دیجیے۔ میں نے تو کہا آپ جو فرمائیں نقل کر دوں۔ فرمایا یہ غزل روانہ کر دیجیے ؎

زباں بند ہے اس عہد پر نگاہ کے بعد　　سکوت ہی مجھے رہتا ہے اب تو آہ کے بعد

۲۰ر اکتوبر ۱۹۱۹ء

سید راحت حسین صاحب چھپرا ضلع سارن کا ایک خط آیا۔ اس میں سید صاحب کی تعریفوں کے بعد استدعا کی گئی تھی کہ مرسلہ غزلیات کو صحیح فرما دیں۔ خط پڑھ کر چیں بہ جبیں ہوئے۔ فرمایا: ان لوگوں نے مجھے بے کار سمجھ لیا ہے بھلا میرا قابُو ہے کہ غزلیات کی اصلاح کرنے بیٹھوں۔ تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد فرمایا: دیکھو ایک شعر موزوں ہو گیا ؎ غ

اب تو نقدی سے کوئی صاحب سراجی خوش کریں
سن چکا ہوں آفریں بھی مرحبا بھی واہ بھی

اگر ان غزلوں کے ساتھ لفافے میں دس (۱۰) کا نوٹ نکلتا تو خیر کچھ دردِ سری اٹھاتا بھی۔ راحت حسین صاحب کو جواب لکھ دیا ستتر واں سال ہے مرتے مرتے بچا خدمت سے قاصر ہوں۔ حیدر آباد سے جسٹس غازی الدین صاحب کے والد نواب عزیز جنگ کا دیوان آیا تھا۔ مجھے دکھایا۔ میں نے قیمت دریافت کی۔ فرمایا: اجی قیمت سے آتا تو میں کیوں لیتا۔ میرے پاس جو کتب یا رسائل آتے ہیں وہ مفت ہی آتے ہیں۔ میں کسی ایرانی کے اس شعر کا مصداق ہوں ؎

ہر مرغ کہ پر زد بہ تمنائے اسیری اوّل بشگوں کرد طوافِ قفس ما

میں نے عرض کیا: کیا خوب شعر ہے۔ اسیری کے متعلق یہ شعر بھی اچھا ہے ؎

طائرے نیست کہ یک رشتہ زبا بر پا نیست
صید یک مرغ نہ کردم ز کہن دامہا

اصل یہ کہ فارسی زبان شعر گوئی کے لیے وضع ہوئی ہے، اُردو نئے سرے بھی جنم لے تو اس میں مطالب کا یہ تحمل پیدا نہیں ہو سکتا۔ مجھے متعدد اُردو اشعار پسند آئے لیکن جب اس مضمون کے فارسی شعر نظر سے گزرے تو اُردو اشعار نہ صرف کم وقعت ہو گئے۔ بلکہ ان میں عیب نظر آنے لگا۔ وزیر کے کلام میں حاصلِ دیوان یہ غزل ہے ؎

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر
زمینِ کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

اور اسی غزل میں حاصلِ غزل یہی مطلع ہے۔ ایک ایرانی نے بھی یہی کہا ہے کہ محبوب کی گلی کی خاک کا ایک ایک ذرہ آسمان کی طرح باعث آزار ہے۔ اسی طرح لاتعداد آسمان بنائے ہیں۔ کہتا ہے ؎

ہر غبارے کز سرِ کوے تو می گردد بلند

بہرِ آزارِ دلِ من آسمانے می شود

چند روز ہوئے امراؤ مرزا صاحب عشقؔ لکھنوی نے افغان شہزادوں کے یہاں اپنا یہ شعر دادِ خاص کی امید میں سنایا ؎

ضعف سے ہاتھ نہیں اٹھتے ہیں دیوانوں کے

رو رہے ہیں کہ کریں چاک گریباں کیوں کر

اتفاق سے میں خزانۂ عامرہ میں ایک شعر فارسی کا اسی مضمون کا دیکھ چکا تھا۔ عشقؔ صاحب کے شعر پر دل سے داد نہ نکلی ان کے استفسار پر میں نے کہا کہ ایک ایرانی کو بھی یہی موقع پیش آیا ہے۔ ضعف سے گریباں تک ہاتھ نہیں جا سکتا کہ جذبۂ جامہ دری پورا ہو۔ غضبناک محبوب اس طرف سے گزرا۔ عاشق کو دیکھ کر ہاتھ مارا اور گریبان پھاڑتا ہوا لے گیا۔ کہتا ہے ؎

رسید یار و گریبانِ من درید و گزشت

بہ دادِ کوتہیِ دستِ من رسید و گزشت

اس ایرانی کا کام بن گیا کہ نہ صرف جذبۂ جامہ دری پورا ہوا بلکہ محبوب کا ہاتھ گلے تک پہنچا اور آپ ہیں کہ "رو رہے ہیں کہ کریں چاک گریباں کیوں کر" عشقؔ صاحب نے سن کر اعتراف کیا اور کہا کہ ایرانیوں کی بلا دُور، ہم سے یہ باتیں نہیں سدھر سکتیں۔ امیرؔ مینائی مرحوم کا یہ شعر ایک عرصے تک دل پر چڑھا رہا ؎

ہائے وہ پھول سے گال اور وہ قد بوٹا سا

وہ جہاں بیٹھتے ہیں باغ لگا دیتے ہیں

لیکن جب فارسی کا یہ شعر دیکھا تو اس کی قدر کم ہوگئی ؎

قدے چو سرو، رُخے ہمچو ارغواں داری
مرو بہ باغ کہ در خانہ گلستاں داری

عزیز لکھنوی کے اس شعر سے دل کئی دن تک لذّت اٹھاتا رہا ؎

بدگماں کو میری میت پر گماں سکتے کا ہے
حکم ہے آئینہ دکھلاؤ مری تصویر کا

لیکن جب فارسی کا یہ شعر نظر سے گزرا ؎

ز جسم جاں برآمد با درت گر نیست جانِ من
بیار آئینہ رخسارِ خود پیشِ دہانِ من

تو عزیز کے شعر میں کھلا ہوا عیب نظر آنے لگا۔ اس ایرانی پر بھی یہی گزری ہے کہ مر گیا ہے۔ محبوب پاس کھڑا ہوا ہے لیکن اسے بدگمانی ہے کہ عاشق مرا نہیں ہے۔ مومن خاں کی سی ترکیب چلتا ہے ؎

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھیے
جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

خود اپنے فائدے کے لیے نہیں محبوب کی خوشی کی خاطر کہتا ہے کہ میں تو مر چکا ہوں آپ کو یقین نہیں ہے تو میرے منہ کے سامنے اپنا آئینہ جیسا گال لاکر تجربہ کر لیجیے، عزیز کا یہ کہنا کہ "آئینہ دکھلاؤ میری تصویر کا" اب نفسیاتی حیثیت سے غلط معلوم ہوا۔ آئینہ دور سے بھی دکھایا جا سکتا ہے لیکن ضرورت آئینے کے پیشِ دہاں لانے کی ہے۔ اگر نفس باقی ہے تو آئینے کی سطح پر بھاپ معلوم ہو جائے۔ یہ فارسی شعر ہر حیثیت سے مکمل ہے۔ عاشق خود جنبش نہیں کر سکتا محبوب کے رخسار کو اس ترکیب سے قریب لاکر بوسے کی ہوس مرنے کے بعد بھی پوری کر لیتا ہے۔ آئینہ رخسار کہہ کر محبوب

کے حسن کی تعریف بھی کہ جاتا ہے اور یہ بھی سچ کہتا ہے کہ اس کی جان جسم سے باہر ہے اس لیے کہ محبوب اس کی جان ہے اور وہ سامنے ہے حقیقت یہ ہے کہ بقول آپ کے ع

ہر اک زباں کو یہ موتی نہیں عطا ہوتے

۲۳ر اکتوبر ۱۹۱۹ء

مولوی رضا حسین صاحب میر منشی سے ملاقات کرنے گاڑی میں جا رہے تھے، میں ساتھ تھا۔ اُن دنوں میں حصّۂ سوم کی ترتیب و نقل کا کام کر رہا تھا۔ میں نے کہا آج میں نے الف کی تقطیع ختم کر دی۔ فرمایا: چلو ایک علّت[1] سے تو پیچھا چھوٹا۔ مولوی رضا حسین صاحب کے یہاں سے واپسی پر راستے میں کالون ہسپتال پڑا۔ میں نے کہا آج کل انفلوئنزا کے مریضوں سے تمام ہسپتال بھرا رہتا ہے۔ اس پر کچھ غور کیا اور فرمایا سے غ

انفلوئنزا سنا آیا ہے یہاں اسپین سے

اے خدا ہم کو تو تو محفوظ رکھ اس بین سے

میں نے عرض کیا کہ اس شعر میں آورد نمایاں ہے اور دوسرے مصرع کی توڑ تو میں میں آپ کی شانِ کلام سے دُور ہے۔ فرمایا سچ کہا، اسے بدلوں گا۔ پھر تھوڑی دیر کے غور کے بعد فرمایا سے

انفلوئنزا چڑھا چوگان بازی اب کہاں

اسپتالی ہو رہے ہیں اسپ تازی اب کہاں

میں نے عرض کیا چوگان بازی کا زمانہ تو بہت عرصے پہلے ختم ہو چکا ہے۔

---

[1] مخفی مباد کہ الف حرفِ علّت ہے۔

اب اس پر افسوس کرنا بے محل ہی صاف ظاہر ہوتا ہی کہ اسپتال کی رعایت سے اسپ تازی کا اہتمام کیا گیا ہی۔ فرمایا: ٹھیرو اس زمین میں اور اچھّے شعر نکل سکتے ہیں چنانچہ حسب ذیل دو شعر گاڑی میں کہے ؎ غ

اب تو ہمیں کر لیا اور چل دیئے گودام کو — جن سے مسجد گونجتی تھی وہ نمازی اب کہاں

اب ہی بی۔ اے کی طلب تفسیر کا کس کو خیال — فکر روزی ہو رہی ہی فخر رازی اب کہاں

میں نے عرض کیا" ان دونوں اشعار میں بھی آخری دونوں مصرعے چُست ہیں اور اوّل دونوں بودے"۔ فرمایا نظرِ ثانی کروں گا (مگر معلوم ہوتا ہی کہ ان اشعار کو چیت اور درست نہ کر سکے اس لیے حصّہ سوم میں ان کو درج نہیں کیا) چلتے چلتے شاید ہسپتال کے تسلسل سے کچھ خیال آیا۔ فرمایا: معلوم ہی کہ ہماری سب سے بڑی نادان دشمن ہستی کون ہی؟ میں نے عرض کیا نہیں معلوم۔ فرمایا: انّا یعنی محبّت میں پیٹ بھرے ہونے پر بھی ٹھونس ٹھونس کر کھلاتی ہی اور بعض صورتوں میں تو ایسا بیمار ڈالتی ہی کہ امراض گور میں اترنے سے قبل تک پیچھا نہیں چھوڑتے۔

۲۴؍ اکتوبر ۱۹۱۹ء

میں مولوی شمس الدین خاں صاحب ایل ٹی کے ہم راہ حاضر ہوا۔ نوٹ بک اندر سے منگوائی شعر سنایا ؎

حواسِ ظاہری کے دام میں اوہام حاضر ہیں
مگر یہ صید خود صیّادِ اطمینانِ خاطر ہیں

میں نے عرض کیا اللہ اللہ شعر کیا ہی نفسیات پر ایک مبسوط رسالہ ہی۔ ایسی ذہنی واردات کا انسان کو احساس تو ہوتا ہی لیکن مطالب کو پورے طور پر سمجھانے کے لیے ہر کس و ناکس کی زبان یاری نہیں دیتی۔ آپ نے

کیسی دقیق بات کو کیسی بیش با افنادہ تشبیہ سے کس آسانی کے ساتھ سمجھا دیا۔ انسان اپنی کم بینی سے سمجھتا ہی کہ خیالات کو میرے احساس نے گرفتار کیا ہی یہ میرے قیدی ہیں لیکن غور سے دیکھیے تو معاملہ اس کے بالکل برعکس ہی۔ یعنی انسان خیالات کے ہاتھ میں خود ایک مجبور اور مضطرب کٹھ پتلی ہی۔

"آنرا کہ عقل بیش غم روزگار بیش"

کسی ایرانی نے کیا خوب کہا ہی ؎

حس ہست کہ سرمایۂ صد درد سر است ۔۔۔ فارغ بال آں کہ از جہاں بے خبر است

ہر چند کہ بیضہ از قفس تنگ تر است ۔۔۔ در بیضہ نمی کنند مرغاں فریاد

اس خیال کو میرے ہم وطن چھٹی میاں نے بھی بڑے سلیقے سے پیش کیا ہی ؎

مجبور ہوں معذور ہوں لاچار رہوں میں ۔۔۔ غم یہ بھی نہیں اگرچہ نادار رہوں میں

ای خالقِ بے نیاز رونا یہ ہی ۔۔۔ اس شدتِ احساس سے بیزار رہوں میں

آپ نے اسی قسم کی لطیف قلبی واردات کو اس شعر میں بھی خوب زبان دی ہی اور انوکھی تشبیہ سے کام لیا ہی ؎

لذّت ہی روح کو تنِ خاکی سے میل میں
فطرت نے مست رکھا ہی قیدی کو جیل میں

فرمایا: ماشاء اللہ آپ نے کیسا قوی حافظہ اور کس قدر بلند مذاقِ سخن پایا ہی۔ کیا آپ کے خاندان میں متعدد شعرا ہوے ہیں۔ میں نے کہا: ہاں ننھیال میں پرنانا مولوی شفاعت اللہ صاحب، ماموں تمنا حسین صاحب، اعلی حسین صاحب اور تولا حسین صاحب یہ سب شاعر ہوے ہیں۔ فرمایا: آپ شعر کیوں نہیں کہتے؟ میں نے کہا: میرا یہی ذوق میری شعرگوئی کے راستے

میں حائل ہے۔ میں شعر کہتا ہوں مگر کہنے سے زیادہ سنتا اچھا ہوں۔ جب خود شعر کہتا ہوں تو خیال مجھ سے کہتا ہے کہ اس مضمون کو عرفی نے یوں ادا کیا ہے۔ مومن خاں یوں کہہ گئے ہیں۔ حضرت امیر خسرو یوں باندھ گئے ہیں۔ اس کے بعد میری طبیعت میرے شعر کے بارے میں خود کہتی ہے کہ یہ کسی کو سنانے کے قابل نہیں ہے۔ فرمایا آپ پختہ کلامی ابتدا میں چاہتے ہیں۔ آپ شعر کہتے رہیں تو یہ خود آ جائے گی۔ شعر کہا کیجیے۔ حیات و ممات کے تذکرے پر میں نے چکبستؔ کا یہ شعر سُنایا۔ ؎

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
قضا کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

حسبِ عادت اس شعر کی داد نہیں دی۔ فرمایا: دیکھیے، میں نے اس مضمون کو کیا کم قوّت سے ادا کیا ہے ؎

بھروسا باغِ ہستی میں نہیں کچھ نخلِ قامت کا
نفس کیا ہے ہوا کی بیل ہے دھوکے کی ٹٹّی پر

حصّۂ سوم کی ترتیب اور نقل کے سلسلے میں یہ شعر آیا ہے ؎ غ

دانتوں میں اُن کا ہونٹ دبایا تو بولے وہ
دیکھو چڑھے ہیں حضرتِ عیسیٰ صلیب پر

میں نے کہا اس شعر کا مضمون رکیک اور بندش پوچ ہے، قابلِ اخراج ہے فرمایا اچھّا آپ کی Recommendation (سفارش) منظور اور یہ شعر دیوان سے خارج کر دیا۔

۵ نومبر ۱۹۱۹ء

کاغذات میں ایک خط نکلا " قبلہ ام دام ظلکم۔ بعد اداے مراسم و کورنش

عرض یہ ہے کہ کمترین کو اگرچہ حضور کی خدمت میں نیاز حاصل نہیں بہت دنوں سے شوق میں بے تاب ہوں۔ مگر کیا کہوں کوئی صورت حضور سے ملنے کی نہیں نکلتی۔ خیر عرض یہ ہے کہ اپنا ایک مجموعہ مسمّٰی بہ "نشترِ یاس" ارسالِ خدمت کرتا ہوں۔ امید کہ از راہِ کرم بہ نظرِ غور ایک ایک لفظ ملاحظہ فرمائیں گے کیوں کہ ہندستان بھر میں حضور والا سے زیادہ کسی شاعر کی جودتِ طبع کا سکّہ میرے دل پر نہیں ہے۔ اگر حضور نے میرے رنگِ تغزل کو پسند فرمایا تو مجھے پوری داد مل گئی۔

امید کہ بشرطِ فرصت ریویو سے محروم نہ فرمائیں گے۔ یا کچھ بھی "نشترِ یاس" کے متعلق رائے قائم کریں، اس کا اظہار کسی پرچے میں ضرور فرمائیں کہ ملک کے اہلِ سخن بھی ملاحظہ کرلیں۔ زیادہ شوقِ قدمبوسی

نیاز مند

مرزا واحد حسین یاسؔ عظیم آبادی

یکم جون ۱۹۱۴ء ساکنِ حال لکھنؤ جھوائی ٹولہ"

فرمایا یاسؔ صاحب نے لکھنؤ میں آکر معیاری پارٹی کو خفیف کرنے کے واسطے غالبؔ پر اعتراضات کا ایک لا متنا ہی سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ ان لوگوں نے بھی ان کو نیچا دکھانے میں کمی نہیں کی۔ ع

"تفو بر رخِ یاس اینک تفو"

یاسؔ کی طرح سے عزیزؔ بھی میری ہمدردی حاصل کرنے کے خواہاں رہے۔ مجھ سے ہر دو سے خط وکتابت ہے۔ یاسؔ صاحب نے "چراغِ یاس" میں مخالفین کو جواب دیتے ہوئے لکھ دیا "میں نے بار ہا اپنے کانوں سے سنا کہ مولانا اکبرؔ الہ آبادی اور مولانا حالؔی پانی پتی اہلِ زبان نہیں ہیں۔

بھاڑ میں جائے ایسی جہالت۔ اگر مولانا اکبر اہلِ زبان نہیں ہیں تو کوئی اہلِ زبان نہیں۔" مختصر یہ کہ یاس صاحب نے مجھ کو غالب سے بڑھا دینا چاہا۔ لیکن ایک انگریزی مثل ہے کہ "غیر مستحق توصیف حقیقت میں مضحکہ انگیز ہوا کرتی ہے"[1]

Praise undeserved is ridisule in disguise.

میں نے اس کو پسند نہیں کیا۔ عزیز صاحب نے غیر معمولی اخلاقی دباؤ ڈالے تو لکھ دیا تھا کہ عزیز صاحب لکھنؤ کے نامور شعرا میں سے ہیں۔ اہلِ ملک "گل کدۂ" طلب فرما کر لطف اٹھائیں۔

عزیز صاحب کا یہ خیال مجھے پسند آیا۔ ع

"کہ میں شعر کہتا ہوں اپنے لیے"

سید صاحب سے اس گفتگو کے بعد راجا پور الہ آباد میں ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے فرمایا کہ عزیز صاحب کے جس خیال کی داد دی جا رہی ہے وہ ابتداءً ۱۹۰۱ء میں میں نے ایک قطعے میں ادا کیا ہے۔ بعد کو لکھنؤ سے ایک خط کے ساتھ وہ قطعہ بھی روانہ کیا جس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

جانشینیِ میر و غالب کی کہاں اور میں کہاں — وہ خدائے فن تھے اُن سے مجھ کو نسبت کچھ نہیں

خاطرِ عزلت نشیں ہے دشمنِ نام و نمود — مرٹی ہے جس پہ دنیا اس سے رغبت کچھ نہیں

چپ رہی محفل تو شانِ بے کمالی گھٹ گیا — واہ وا کا غل ہوا تو بھی فضیلت کچھ نہیں

---

[1] یاس صاحب سے حال میں حیدر آباد میں ملاقات ہوئی تو غالب کے خلاف مضامین کے متعلق انھوں نے صفائی کے ساتھ کہا کہ میں نے ایک ہزار رکعتوں کی نیت ضد میں باندھی ہے۔

اپنے لطفِ طبع کے باعث ہی شغلِ شاعری　　آپ خوش ہوں سن کے اس کی بھی ضرورت کچھ نہیں
جوہرِ قابل ہی جس کو ماں لبسِ اہلِ مذاق　　خود وحیدِ عصر بن بیٹھے تو عزت کچھ نہیں

۲۵ ر اکتوبر ۱۹۱۹ء

فرمایا: کل آپ کے چلے جانے کے بعد با وجود رعشہ کے میں نے دو صفحے اور لکھے۔ ان اشعار کو بتائیے خارج کروں یا رہنے دوں۔ غ

صد شکر کہ اس بت نے کیا آج بی۔اے پاس
اب اتنا ہی باقی ہی کہ ہو جائے میرے پاس

میں نے عرض کیا یہ شعر مضمون اور بندش ہر دو کے لحاظ سے قابلِ اخراج ہی۔ اتنا سن کر شعر قلم زد کر دیا۔ غ

محبوب ہی ہر قوم میں مذہب بھی ہی کیا چیز
آپ اس سے الگ ہو گئے مطلب بھی ہی کیا چیز

میں نے کہا اسے قائم رکھیے۔ فرمایا: نہیں، آپ نے دل سے نہیں کہا، اس میں بھی ڈھیلا پن ہی۔ یہ کہ کر اسے بھی خارج کر دیا۔ جب یہ شعر آیا ؎ غ

انعام اس سخن کا دس آج اور سو کل
اللہ ہر جگہ ہی اوتار و پیر لو کل

تو میں نے کہا ارے اس میں تو قافیہ نادرست ہی اقوا کا عیب ہی۔ حرف روی واو کے ماقبل حروف سین اور لام کی حرکت میں اختلاف ہی۔ نیز دونوں مصرعوں کی روانی خراب ہی۔ قدم قدم پر طبیعت جھٹکا کھاتی ہی۔ اتنا سن کر خفا ہو گئے اور فرمایا ؎

قاعدوں میں حسنِ معنی گم کرو
شعر میں کہتا ہوں ہجے تم کرو

میں نے عرض کیا اس میں حسنِ معنی بھی تو نہیں ہے دوسرے مصرعے کی خاطر جس میں کوئی خاص بات نہیں، آپ پہلا مصرع زبردستی لائے ہیں نیز اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ آج کیوں ناقدری ہے اور کل کیوں قدر ہوگی۔

بگڑے تیوروں کے ساتھ فرمایا: نہیں، روانی معنی سب ٹھیک ہیں۔ شیخ سعدیؒ کی طرح سے مجھ کو بھی "من گفتم و محاورہ شد" کی سند حاصل ہے جس شعر کو میں رواں اور ٹھیک سمجھوں وہ رواں اور ٹھیک ہی ہے۔ میں نے عرض کیا محسن کاکوری انگریزی سے ناواقف تھے "سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل" والے قصیدے میں انگریزی لفظ کاونسل Council کو غَلَط باندھ گئے ہے

ابر میں دیکھ کے اڑتے ہوئے بگلوں کی قطار
لوگ کہتے ہیں کہ کرتے ہیں فرنگی کونسل

اس پر اعتراض کیا گیا کہ آپ سین کو بالفتح نہیں کہہ سکتے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں کب کہتا ہوں، لوگ کہتے ہیں "کہ کرتے ہیں فرنگی کونسل"۔ مراد یہ کہ کونسل کا سین بالفتح غَلَط العام ہے، اس لیے فصیح سمجھا جانا چاہیے۔ آپ کا لوکل غَلَط العام بھی نہیں ہے۔ فرمایا شعرا کو استحقاق ہے کہ انگریزی الفاظ کا تلفظ ضرورتِ شعری کے مدِّنظر تبدیل کرلیں۔ میں نے عرض کیا کہ اگر کوئی انگریز اپنی ضرورت یا سہولت کے مدِّنظر اُردو الفاظ کے تلفظ کو بگاڑ کر ادا کرتا ہے تو ہم کو بھی حق نہیں ہے اس کا مضحکہ اڑائیں کہ ع

کیسا احمق لوگ تھا پاگل کو پھانسی کیوں دیا

یا یہ کہ ع

یہ تم کس واسطے لکھا یہ تم کس واسطے بولا

آپ نے ایک اور جگہ انگریزی لفظ Press (پریس) کو قافیے کی خاطر کس کے وزن پر پرس کر دیا ہے بہت بگڑ کر فرمایا: میں نے اہلِ لکھنؤ کو بھی اُن کے ایک اعتراض پر یہی جواب دیا تھا اور اب آپ کو بھی یہی جواب دیتا ہوں کہ:

من گفتم و محاورہ شد

اور بس۔ میں نے عرض کیا میں نے اپنی ایک عزیزہ کے سامنے اُن کے ایک گندے اور بدتمیز لڑکے کی شکایت کی۔ کہنے لگیں: تھیں معلوم نہیں کہ وہ مجھے اس قدر پیارا کیوں ہے۔ بات یہ ہے کہ اس کا ذہن بہت تیز ہے۔ مجھے ان کے اس ارشاد میں بہت شک تھا۔ مگر یہ خیال کرکے کہ اُن کی اولاد ہے بات نہیں بڑھائی۔ اس پر سیّد صاحب سخت برہم ہو کر کہنے لگے کہ اجی میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کو میرا شعر خارج کرنے کا کیا حق ہے۔ میری طبع زاد اولاد نالائق بدتمیز جیسی کچھ ہے میرے لیے اچھی ہے۔ میں نے غیرمعمولی برہمی دیکھی تو سکوت اختیار کیا اور وہ لوکل والا شعر حصّۂ سوم میں نقل کر دیا۔ اس کے بعد اُن کے اس شعر کا دل ہی دل میں مزا لیتا رہا ؎

کرتا ہوں ہر اینٹ پر نوحے رُکا رہتا ہے کام
تنگ ہے وہ شوخ مجھ تاریخ داں مزدور سے

سیّد صاحب نے اس دن اتنی حجّت کی اور لوکل والا شعر حصّۂ سوم میں شریک کرا لیا۔ لیکن بعد کو حصّۂ سوم چھپ کر آیا تو میں نے دیکھا یہ شعر اس میں موجود نہ تھا۔

۲۵ر اکتوبر ۱۹۱۹ء

فرمایا گورنر صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری مسٹر برنس کے سامنے کچھ آزادی کا ذکر نکلا۔ میں نے برنس صاحب سے کہا انسان کا یہ مغالطہ ہے کہ خود کو آزاد سمجھتا ہے۔ سانس لینا بھی ایک قسم کی مجبوری اور قید ہے۔ آدم زاد میں جب تک دم ہے آزاد نہیں ہوسکتا۔ آدم زاد سے دال اور میم یعنی دم نکالو تو آزاد رہ جاتا ہے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد فرمایا آدم زاد تو آدم زاد نباتات کا بھی یہی حال ہے کہ جب تک سر نہ کٹے آزاد نہیں مثلاً Tree کے T کا سر کاٹو تو F ہوجاتا ہے۔ اب اس کو ree کے ساتھ ملاؤ تو Free ہوجاتا ہے جس کے معنی ہیں آزاد۔ سرسید کے متعلق فرمایا کہ انھوں نے کافی غور نہیں کیا اور مغربی لیلا سے مشرقی مجنوں کو ملا دیا۔ نتیجہ اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ نئی پود بے حیا، بے ادب، فضول خرچ اور نمائش پسند ہوگئی۔ میں نے اسی پر کہا ہے ؎

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
جنھیں پڑھ پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

گزران کا ہو کیوں کر حلقۂ اللہ اکبر میں
پلے صاحب کے بنگلے پر مرے صاحب کے دفتر میں

۲۷ر اکتوبر ۱۹۱۹ء

بار بار پیشاب آنے کی شکایت تھی۔ باتیں کرتے کرتے میں نے پوچھا: اس وقت کیا وقت ہوگا؟ گھڑی کی طرف ہاتھ لے گئے اور گھڑی

ہاتھ میں لے کر ہاتھ روک لیا۔ فرمایا اس کے دیکھنے کی کیا ضرورت ہے میں
یوں ہی حساب کر کے بتا سکتا ہوں۔ میں نے عصر کی نماز ٹھیک ۴ بجے پر
پڑھی تھی جب سے اب تک تین دفعہ پیشاب کو جا چکا ہوں اور پیشاب
مجھے ہر نصف گھنٹے کے بعد آتا ہے اس حساب سے اس وقت
چھ بجے ہوں گے اب ہاتھ ہٹا کر گھڑی کو دیکھا تو واقعی چھ بجے تھے
میں نے عرض کیا کہ اسی قسم کا ظریف لکھنوی کا ایک شعر ہے ؎

ہجر کی گھڑیاں گنا کرتے ہیں عاشق رات بھر
یہ نہیں معشوق بنتے بنتے گھنٹہ گھر بنے

بہت ہنسے میں نے عرض کیا کہ ایک دفعہ شکار سے واپسی پر ایک
دھوبی سے وقت دریافت کیا۔ اس نے بھی ایسا ہی جواب دیا تھا
کہ میرا گدھا بارہ بجے کے گولے کے بعد سے اب تک دو دفعہ بولا ہے
اس کی عادت ہے کہ ہر آدھ گھنٹے کے بعد رینگتا ہے اس حساب سے اب
ایک بجا ہوگا۔ اس پر فرمایا کہ ایک شیخ صاحب کو عروجِ ماہ پر چاند
کی ہر پہلی تاریخ کو دورہ پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ لوگوں میں رویتِ ہلال
کے بارے میں اختلاف رائے ہو گیا تو ان میں سے ایک صاحب نے
یوں تصفیہ کیا کہ جھگڑا کاہے کا ہے، جا کر شیخ صاحب کو دیکھ آؤ دورا پڑا
ہے یا نہیں۔ اگر پڑا ہے تو آج یقینی پہلی تاریخ ہے۔

ایک صاحب کا خط آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ صاحبِ ذوق ہوں مگر
مفلس۔ براہِ خدا دیوان کا ایک نسخہ مفت عنایت فرمائیے۔ فرمایا یہ حضرت
آج خدا کا واسطہ دے کر دیوان مفت مانگتے ہیں کل فرمائش کریں گے
کہ خدا کے واسطے جانکی بائی کا گانا مفت سنوا دیجیے۔ میں نے کہا

ممکن ہی پرسوں کہیں کہ کربیں ماڈا یلین کے برہنہ رقص کا انتظام کرادیجیے، صاحب ذوق ہوں۔اس لیے سرچشمہ شاید گرفتن بہ بیل۔بہتر یہی ہی کہ دیوان نہ بھیج کر آیندہ مصائب کی روک تھام کیجیے۔خوب ہنسے۔دیوان نہیں بھیجا۔

۳۰ر اکتوبر ۱۹۱۹ء

فرمایا یہ فقرہ کہ "مجھ سے تین پانچ نہ کرو" کسی موحد کا کہا ہوا ہی اس لیے کہ تین سے مراد تثلیث اور پانچ سے مراد پنجتن ہیں۔ فرمایا دیکھو میں نے یہ شعر لوگوں کے بناوٹی غم پر کہا ہی ؏

کیوں کر کہوں کہ حضرتِ شیعہ کو غم نہیں
لیکن وہ فربہی میں تو سنّی سے کم نہیں

سید صاحب کے ملاقاتی اور عزیز ایک صاحب ناصر میاں جو دمہ میں مبتلا تھے ایک یکّے میں تشریف لائے۔سیّد صاحب نے پوچھا: کیسے آئے؟ انھوں نے کہا بہت دنوں سے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔یکّے میں آیا ہوں۔ یکّے والا کرایے کے واسطے باہر کھڑا ہی۔اتنا سن کر سیّد صاحب سخت بے کیف ہوے۔فرمایا: آپ سے کس نے کہا تھا کہ آپ مجھے یکّے میں دیکھنے آئیں۔اس وقت کرایہ دے دیتا ہوں آیندہ کرایے کی سواری میں تکلیف نہ کریں۔ ہائے سیّد صاحب دنیا کو الزام دیتے ہیں اور خود نہ سمجھے ؎

جس سے تھا خود داریٔ اربابِ حاجت کا نباہ
وہ طریقہ تم سے ای اہلِ کرم جاتا رہا

مجھ سے فرمایا میں نے آپ کے خاندان اور استعداد کا تذکرہ

کل اپنی ہمشیرہ سے کیا تھا۔ وہ کہنے لگیں کہ اگر قمرالدین اپنی شادی ہمارے خاندان میں کرنا چاہیں تو ہوسکتی ہے۔ راجا میاں کی خوش شکل اور خوش سلیقہ لڑکیاں موجود ہیں۔ میں نے عرض کیا: ہم شیوخ صدیقی اب تک سادات سے نہیں ملے ہیں۔ دوسرے یہ کہ میری شادی خاندان ہی کی ایک لڑکی سے والد صاحب نے طے کرلی ہے ورنہ میں اُن سے تذکرہ کرتا۔ یہ سُن کر خاموش ہوگئے۔ فرمایا آج کل لوگ راحت و عزّت کی زندگی سہل نہیں گزار سکتے اب اگر آرام سے جینا چاہتے ہیں تو ہر شخص بادشاہ تو بن نہیں سکتا مزدور بنے۔ اس خیال کو یوں ادا کیا ہے ؎ غ

باقی نہیں وہ رنگ گلستانِ ہند ہیں

محنت کا اب ہے کام قلستانِ ہند ہیں

میں نے عرض کیا کہ اس میں آورد کا رنگ زیادہ جھلکتا ہے۔ فرمایا دیکھو قافیے کی اختراع پر خیال آیا۔ میں نے یوسفتان تراشا ہے۔ محمد علی اور شوکت علی کے قید ہونے پر اس خیال کو انھوں نے جیل جاکر لوگوں کے دل کے خوفِ سزا کو اشتیاقِ سزا سے بدل دیا یوں ادا کیا ہے ؎

مصریوں نے یوسفستاں کردیا

اب نگاہیں پڑ رہی ہیں جیل پر

میں نے عرض کیا یوسفستان اصل میں عرفی کی اختراع ہے۔ فرمایا: مجھے اس کا علم نہ تھا۔

یکم نومبر ۱۹۱۹ء

یہ شعر سُنایا ؎

پوستینِ گدا میں پڑ جانا — کیا یہی بادشاہ کرتے ہیں

اور فرمایا کہ اگر حکومت درویشوں کو ستائے گی تو اُلٹ جائے گی۔ میں نے عرض کیا کہ "در پوستین کسے افتادن" عیب چینی کرنے کے معنی میں فارسی محاورہ ہے، اُردُو محاورہ نہیں ہے۔ فرمایا میرے نزدیک کسی شعر میں خواہ مضمون نہ ہو اگر زبان کا کچھ لطف ہو تو اسے قائم رہنا چاہیے پھر غور کر کے فرمایا اچھا اس شعر کو کاٹ دو۔ ایبٹ آباد کے ایک پنجابی وکیل الف دین نے اپنی تصنیف کردہ ایک کتاب روانہ کی۔ الف دین نام کی انجوبگی نے طبیعت نے گدگدی پیدا کی۔ فرمایا پنجاب میں بھی عجیب عجیب نام رکھے جاتے ہیں چراغ دین گل زگلزار فاطمہ سڑک از کوسے محمد، تھوڑی دیر تک ہنستے رہے۔ پھر وکیل صاحب کو لکھ دیا ؎

الف دین نے خوب لکھی کتاب

کہ بے دین نے پائی راہِ صواب

میں نے عرض کیا کہ آپ نے خوب بات پیدا کی اب تک میرے ذہن میں اس قبیل کا شعر آغا شاعر قزلباش دہلوی کا قابلِ داد تھا ؎

جاتی رہی ہے دل سے تمنّائے انبساط

جب سے سبق پڑھا ہے الف لام میم کا

فرمایا آپ کو وہ میرا شعر یاد نہیں ہے ؎

الف بے تے ہی کو پڑھ کر میں سمجھا

الف اللہ کا اور ماسوا بت

فرمایا پچھلی بیماری میں طبیعت زیست سے مایوس ہوگئی تھی، خدا سے لو لگی ہوئی تھی۔ اس حالت میں یہ شعر کہے تھے۔ خدا جانے کسی قابل

ہیں یا محض ایک مجذوب کی بڑ ہیں ؎ غ

مجھے کیا خبر کہ ہے کیا اثر نہ وہ ہوش ہے نہ وہ شان ہے
فقط اک نظر ہے جہان پر نہ خیال ہے نہ گمان ہے
نہ دماغ صرفِ رہِ نظر نہ دلیل باعثِ دردِ سر
وہی جوشِ حیرت و بے خودی نہ قیاس ہے نہ گمان ہے
نہ یہاں حدود کا نشاں کہیں نہ محلِ حرف و بیاں کہیں
مرا عشق ہے ترا حسن ہے مری آنکھ ہے تری شان ہے

۳ر نومبر ۱۹۱۹ء

مولوی عشرت حسین صاحب کے خسر مولوی احمد حسین صاحب مذاقِ نوّاب پریانواں کا تذکرہ نکالا۔ فرمایا ہمارے سمدھی صاحب کی ابتدائی تربیت چونکہ حنفی ماحول میں ہوئی تھی تصوّف سے طبیعت کو لگاؤ ہے ورنہ اہلِ تشیع تصوّف و عرفان سے زیادہ سروکار نہیں رکھتے۔ انھوں نے ایک کیسا بلند عارفانہ شعر نکالا ہے ؎

نشاں تیرا ہر اک شے سے عیاں ہے بے نشاں ہوکر
تری قدرت کا طوطی بولتا ہے بے زباں ہوکر

فرمایا اس قافیے کو میں نے اس طرح باندھا ہے ؎

زبانیں دیکھتی ہیں آفتِ تقریر کو چپ ہیں
نگاہیں داستانیں کہہ رہی ہیں بے زباں ہوکر

دوسرا شعر سنو ؎

کیا اچھا جنھوں نے دار پر منصور کو کھینچا
کہ خود منصور کو مشکل تھا جینا رازداں ہوکر

فرمایا: دیکھو میں نے حضرت منصور کو انا الحق کہنے پر معذور قرار دیا ہے ؎

عرفان ضو فگن ہے شریعت کی آڑ سے
آتش فشاں زمین دبی ہے پہاڑ سے

جب آتش فشاں مادہ زور کرتا ہے تو زمین کا طبقہ اڑ جاتا ہے۔ قلبِ انسانی زورِ عرفاں کو کیا روکے۔ میں نے عرض کیا کہ محمد جان قدسی نے اسی بات کے اظہار کے لیے اس سے زیادہ پیاری تشبیہ سے کام لیا ہے فرماتے ہیں ؎

آں نور کہ زد در شجرِ طور آتش | افروخت ز دار بہرِ منصور آتش
رسوائی حلاج ندارد حیرت | ہرگز نہ شود بہ پنبہ مستور آتش

حلاج کی رعایت سے روئی کو منتخب کیا ہے کہ شعلے کو نہ دبا سکی۔
فرمایا: واقعی خوب کہا ہے مگر میری تشبیہ اس خیال سے جدا ہے اور اوّل تو مجھے یہ خیال معلوم بھی نہ تھا۔ فرمایا ایک اور عارفانہ مطلع دیکھو ؎

میں جس کے خامۂ قدرت کا نقشِ حیرت افزا ہوں
وہی سمجھے کہ وہ کیا ہے وہی جانے کہ میں کیا ہوں

اس مقطع کو دیکھیے ؎

جنابِ حضرتِ اکبر کی کوئی نبض تو دیکھے
یہ کہنے کو تو ہر حالت میں کہہ دیتے ہیں اچھا ہوں

فرمایا: حکومت کی پالیسی کی کامیابی پر دُعا سنو ؎ غ

زندگی ہوئے دراز ان کی خوش اقبالی کی
مولی صاحب کی نہ چلتی ہے نہ بنگالی کی

۷ر نومبر ۱۹۱۹ء

حصۂ سوم کی نقل کے سلسلے میں آیا ؎

چاہتے ہو تم کسی کو چاہتا ہو وہ تمھیں
زندگی یہ ہے نہیں تو زندگی اچھّی نہیں

میں نے عرض کیا کہ یہ نو مشقوں کی سی بے کار گفتار ہے۔ فرمایا: ہاں ذرا ڈھیلا پن ہے مگر رہنے دو۔ فرمایا ترکی اور ایران کی بربادی اور افغانستان پر گولہ باری سے طبیعت پر بار تھا اس کو یوں ہلکا کیا ؎ غ

اپنی تہ میں ای زمیں اب مجھ کو جائے گور دے
وہ رہے زیرِ فلک اللہ جس کو زور دے
اب تو ہے اہلِ بصیرت کی خدا سے یہ دُعا
دفعہ کر نادیدنی یا مجھ کو چشمِ کور دے

اس شعر پر ؎

ان کے دل میں جو کچھ آتی ہے وہ کہہ جاتے ہیں
ہم بھی سن لیتے ہیں منہ دیکھ کے رہ جاتے ہیں

میں نے عرض کیا اس کے دوسرے مصرع میں اگر یوں ترمیم فرمادیں تو شاید کچھ بہتر ہو جائے :۔

اور ہم سنتے ہیں منہ دیکھ کے رہ جاتے ہیں

فرمایا: نہیں ایسا ہی رہنے دیجیے۔ جب یہ شعر آیا ؎ غ

غیر کی چالوں نے زچ یوں ہی کیا ہے مجھ کو
آپ کیوں اور اسے دینے کو شہ جاتے ہیں

میں نے عرض کیا اس شعر میں نری لفظی شطرنجی رعایتیں اور قافیہ پیمائی ہے۔ فرمایا: ہاں اسے نکال دو۔ جب حصۂ چہارم ترتیب دوں گا تو لیے

قافیہ بندی اور لفظی رعایتوں کے اشعار سب نکال دوں گا۔

۸ر نومبر ۱۹۱۹ء

مسلمانوں کی تباہی اور حکومت کی بدگمانی کے سلسلے میں فرمایا کہ یہ اشعار میں نے سیاسی نقطۂ نظر سے کہے ہیں۔ غ

بھلا کیا پوچھتے ہو حالِ اکبرؔ اِس زمانے میں
کہ وہ نیٹو بھی ہے ہندوستانی بھی مسلماں بھی

عدو کی شست سے بچتے نہیں ہیں
یہ کالے ہیں مگر کوّے نہیں ہیں

شکارِ بدگمانی ہند میں ہم آج ہر سو ہیں
مسلمانی نہیں ہوتی تو کہہ دیتے ہیں ہندو ہیں

ستم کی کامیابی پر مبارک باد دیتا ہوں
یہ ان کی بدگمانی ہے کہ فریادی سمجھتے ہیں

یہ سنانے کے بعد ؎ غ

بندِ نقاب یار نہ کھولے تو کیا کروں
منّت تو کر رہا ہوں نہ بولے تو کیا کروں

جب یہ شعر آیا ؎

دھسکی گراں ہے کشتۂ فولاد پُر خطر
افیون اب مریض جو گھولے تو کیا کروں

تو میں نے عرض کیا قافیہ گھولے سے آپ کو افیون کا خیال آیا اور افیون سے دوسری نشّی و مقوّی اشیا کا۔ دوسرے مصرع میں "تو کیا کروں" بے کار سا ہے۔ اگر تبدیل ردیف کے ساتھ یوں ہوتا:

افیون اب مریض نہ گھولے تو کیا کرے

تو زیادہ موزوں ہوتا۔ فرمایا: ہاں، محض قافیے نے یہ شعر کہلوایا ہے، مگر رہنے دو، کیا کروں ؎

دھوم ہے دل میں مرے قافیہ پیمائی کی
جا کے گنگا پہ کہا کرتا ہوں جے مائی کی

فرمایا: آپ آجاتے ہیں تو طبیعت بہل جاتی ہے۔ الہ آباد پراگ والوں کا شہر ہے، یہاں ہم مذاق کوئی نہیں، آپ کو اپنی مصروفیتوں سے بار بار آنے جانے اور زیادہ ساتھ رہنے کی فرصت نہیں۔ سوچتا ہوں کہ کچھ دنوں کے واسطے دہلی ہو آؤں، گھر کا انتظام کیا کروں۔ عشرت کی بیوی رئیس کی بیٹی ہیں یہاں آکر کیوں رہنے لگیں۔ ایک صاحب میر . . . . دوسرے صاحب مولوی . . . . صاحب کے یہاں دونوں وقت روٹیاں توڑتے تھے۔ ایک شخص نے اعتراض کیا تو کہنے لگے "کا سینت رہت ہیں؟ ہمار بیٹا کام دیت ہے"۔ (کیا مفت رہتے ہیں؟ ہماری بیٹی کام دیتی ہے) عشرت میری بیٹی نہیں مگر میری غیرت گوارا نہیں کرتی کہ پریانواں جاکر رہوں۔ فرمایا دیکھو ان اشعار میں میں نے مذہب سے بیگانہ اہلِ تشیع پر طعن کی ہے ۔ غ

دعویٰ تو یہ ہے کہ ہم کھلیں گے اک دن ۔۔۔ اس سے کیا بحث ہے کلی ہوں کہ نہ ہوں
الفاظ کی موج میں بنے ہیں مومن ۔۔۔ اخلاق میں پیرو علیؓ ہوں کہ نہ ہوں

ذکر ہمدردیِ مولا پہ کھلے پڑتے ہیں ۔۔۔ خود مگر کیمپ میں ہیں رے یہ پلے پڑتے ہیں

فرمایا رے سے مراد صوبہ رے ہے۔ شعر سنایا ؎

اودھ کی خوب کٹی چند روز چین کے ساتھ
عجیب عیش رہے ماتمِ حسینؓ کے ساتھ

۲۵ر دسمبر ۱۹۱۹ء

اس کے بعد میری حاضری کا اتفاق نہیں ہوا۔ سید صاحب دہلی چلے گئے۔ وہاں سے خطوط آتے رہے جو گزشتہ باب میں نقل ہو چکے ہیں۔ ۲۴ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو خط سے آمد کی اطلاع پاکر میں حاضر ہوا

دہلی اور سفر کے واقعات بیان فرماتے - فرمایا لوگ مجھ پر اعتراض کرتے ہیں کہ اکبر، صرف کہتے ہیں کرتے کیا ہیں - عزیز مرزا صاحب کے اس کہنے پر وا حدی صاحب نے ان کو جواب دیا تھا کہ کرنے والوں کے لیے اس کی بہت ضرورت ہے کہ ان کو کوئی اچّھا کہنے والا ملے - مگر میں کہتا ہوں معترضین میری مجبوریوں پر نظر نہیں کرتے - میں اب بجز کہنے کے کر ہی کیا سکتا ہوں ؟ لوگوں کے ان اعتراضات کا جواب میں نے اس شعر میں دیا ہے ؎

عالمِ سعی میں ہیں اتنا ہی ہم میں زور ہے
ہاتھ میں رعشہ ہے اب لیکن قلم میں زور ہے

۱۲ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء

سیّد صاحب دہلی سے آئے تھے تو ایک نوجوان شخص عزیز نامی کو ساتھ لائے تھے جن کے متعلق مجھے دہلی سے ایک خط میں لکھ چکے تھے: "جو نقل کتاب آپ نے شروع کی تھی وہ کام یہاں ایک خوش عقیدہ نیک نوجوان نے کرنا شروع کر دیا ہے - اگرچہ وہ تحقیقِ نظر کہاں" آج حاضر ہؤا تو ان کے متعلق فرمانے لگے: خواجہ صاحب نے ان کو اس خیال سے میرے پاس روانہ کیا تھا کہ میرے ساتھ رہیں، حصّۂ سوم کی نقل میں مدد دیں اور کوئی نادر بات میرے منہ سے نکلے تو اسے نوٹ کر لیا کریں - ان حضرت نے تو میرا ناطقہ بند کر دیا ہے - ہر وقت میرا منہ تکتے رہتے ہیں - میرے لب ہلے اور ان کا قلم چلا - صبح میں نے بیٹھے بیٹھے کہا "کل من علیہا فان" ان حضرت نے فوراً کچھ نوٹ کر لیا - میں نے پوچھا: کیا لکھ لیا؟ فرمایا: یہی لکھا ہے کہ آج صبح آٹھ بج کر دس منٹ پر

حضرت اکبر نے فرمایا "کل من علیہا فان"۔ میں نے کہا اللہ تم پر رحم کرے اسے کاٹو یہ حضرت اکبر کا فرمایا ہوا نہیں حضرت ربِّ اکبر کا ہے۔ فرمایا: میں نے اسی بات کو یوں نظم کر دیا ہے ؎

سب کو فنا خدا کو بقا بات حق یہ ہے
میں کیا کہا کہوں گا ہے یہ خدا کی کہی ہوئی

۱۴ر جنوری سنہ ۱۹۲۰ء

ایک برہمن اکاؤنٹینٹ آفس میں کلرک تھے وہ سید صاحب کے یہاں آتے رہتے تھے۔ سیّد صاحب ان کی سنسکرت کی مہارت اور اُدبی ذوق کی تعریف کر چکے تھے۔ وہ آج اپنے تین بچوں کے ساتھ آئے۔ اُن بچّوں کی ماں مر چکی تھی۔ سیّد صاحب نے اُن کو شفقت سے بٹھایا۔ تھوڑی دیر بعد پنڈت جی نے کہا آج میرا اور اس بچّی کا روزہ ہے۔ اس ارادے سے آیا ہوں کہ کچھ خشک یا تر پھلوں وغیرہ سے آج آپ کے یہاں روزہ کھولوں۔ یہ سنتے ہی سید صاحب نے فکر مندانہ انداز سے فرمایا: اجی اس گھر میں کیا انتظام ہو سکتا ہے، یہاں نوکروں کو خود میرے کھانے کی فکر نہیں۔ مگر دیکھیے میں روزہ کھولنے کے لیے کوئی سبیل کرتا ہوں۔ نوکروں کو آواز دے کر کہا "سلیمان اندر گھر میں سے آپ کو آٹھ دس بادام لاکر دے دو"۔ برہمن پر یہ سُن کر بجلی سی گری۔ اس کے بعد سے میں نے پنڈت جی کو عشرت منزل آتے کبھی نہ دیکھا۔ غالباً جز رسی کے جواز کے سلسلے میں خیال آیا، مجھے یہ شعر سُنایا ؎

پارک میں زر دے کے مالی سے گُل بے بُو لیا
مال ضائع کرنے کا ہے تم کو مالیخولیا

۲۱ر جنوری سنہ ۱۹۲۰ء

فرمایا لائڈ جارج صاحب نے قیام اَمن کے لیے تمام غیر مسیحی دنیا کو عیسائی ہو جانے کی دعوت دی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کیا عیسائی تو میں آپس میں نہیں لڑتیں۔ سب کے عیسائی ہو جانے کے بعد بھی حقیقی اَمن قائم نہ ہوگا۔ حقیقی اَمن اس وقت ہوگا جب بُرے ایک طرف کر دیے جائیں اور اچھے ایک طرف۔ اور یہ ہونا قیامت میں ممکن ہے کہ دوزخی دوزخ میں ہوں اور جنّتی جنّت میں۔ اس کے واسطے سب کو عیسائیت کی طرف بُلانے کی بجائے حضرت عیسٰی ہی کو دنیا کی طرف کیوں نہ بلا لیا جائے کہ قیامت آکر حقیقی اَمن قائم ہو جائے۔ نقضِ اَمن کے موجب حضرت خود ہیں اور اس واعظانہ ہیر پھیر سے دنیا کو دھوکا دیتے ہیں۔
میں نے عرض کیا: احمق پھپھوندوی کا شعر ہے ؎

جو مَرے بربادیِ اسلام کی تلقین میں
قبر اس کی ہو گلیڈ اسٹون کی پائین میں

فرمایا: لائڈ جارج کے اسی خیال سے متاثّر ہو کر میں نے کہا ہے ؎ غ

کسی کے فتنۂ قامت کا ظلم ہے اے حشر
تری طرف سے بھی اٹھے خدا کرے کوئی

(یہ دُعا ۱۹۲۲ء میں پوری ہوئی اور مصطفےٰ کمال کے اٹھنے کے ساتھ لائڈ جارج کی وزارت بیٹھ گئی) فرمایا: دیکھو خدا کے سلسلے میں خیال آیا! میں نے راجا اور رئیس لیڈروں کے لیے کہا ہے ؎

خدا کی راہ میں پہلے بسر کرتے تھے سختی سے
محل میں لیٹ کر اب عشقِ قومی میں تڑپتے ہیں

دیکھو، خدا پر ایک اور شعر ذہن میں آیا جس طرح شعلے کا تصور بغیر روشنی کے نہیں آسکتا اسی طرح ہم کو اپنی زندگی کا احساس بغیر خدا کے تصور کے نہیں ہونا چاہیے مگر افسوس ہے کہ ایسا ہوتا ہے۔ یہ ہماری انتہا درجے کی حرماں نصیبی ہے کہ خدا نے خود کو ہم سے ایسا علیحدہ کر لیا کہ اب زندگی میں بسا اوقات اس کا تصور بھی نہیں اس خیال کو اس طرح ادا کیا ہے ؂ غ

طبیعت اس تصور سے بہت مایوس ہوتی ہے
کہ بے یادِ خدا بھی زندگی محسوس ہوتی ہے

فرمایا: ذرا حسن و عشق کی ایک ادا دیکھنا ؂

جب کہا میں نے کہ پیار آتا ہے مجھ کو تم پر
ہنس کے کہنے لگے اور آپ کو کیا آتا ہے

میں نے عرض کیا آپ نے ان دو مصرعوں میں جہانگیر اور نور جہاں کے سوال و جواب سے زیادہ لذت بھر دی ہے جہانگیر نے حسب ناراض نور جہاں کے سامنے یہ مصرع پڑھا تھا ع

نمی آید بغیر از گریہ دیگر کار از چشم

تو نور جہاں نے جواب دیا تھا۔ ع

بلے از مردم بے دست و پا دیگر چہ می آید

۲۴ر جنوری ۱۹۲۰ء

فرمایا انسان جس طاقت سے چاہے لڑے لیکن فطرت سے نہیں لڑ سکتا۔ ایک لیڈر نے فطری نتائج کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنی جوان لڑکی کو موقع دیا کہ ایک غیر قوم خوب صورت اور قابل

نوجوان سے بے تکلف راہ و رسم رکھے۔ چند دن نہیں گزرے کہ وہ اس لڑکی کو لے بھاگا۔ اس پر مجھے پہلے یہ مضمون سوجھا کہ "یہ گیا سے باز آئے وہ بٹیا سے باز آئے" مگر یہ خیال اچھی طرح نظم نہ ہوسکا تو یوں کردیا ؂ غ

ساتھ اڈیٹر کے ہوگئی رخصت　　انڈیپنڈنٹ کیوں کیا تھا اُسے

اس سے مجھے خیال آیا کہ ان لیڈر صاحب نے عزیز مصر کی سی غلطی کی تھی کہ یوسف جیسے حسین و جمیل نوجوان سے بے تکلفی بڑھانے پر بی بی زلیخا کو منع نہ کیا ؂

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہیں جواں بھی
شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

فرمایا رسول اللہؐ نے ہم کو مسلمان بنایا تھا مگر اہلِ یورپ نے (چونکہ خود عیسائی ہیں) ہمیں محامڈن مشہور کردیا افسوس یہ ہے کہ یہ نام ہمیں طعنہ (Mickmame) نہیں معلوم ہوتا۔ فرمایا ایک صاحب نے مہاراجا کشن پرشاد بہادر کا یہ شعر سنایا ؂

اچھّے وہی جو جل کے تری خاک رہ بنے
مٹی خراب طالبِ گور و کفن کی ہے

اس شعر کے ایک پہلو کے زور کو دیکھ کر میں نے بھی اس کے دوسرے پہلو پر خیال کیا اور خیال کو اس طرح ادا کیا ؂

دیر میں عاشقوں پہ ظلم یہ ہے　　بعد مرنے کے بھی جلاتے ہیں

۶ر فروری ۱۹۲۰ء

نوٹ بک کھول کر یہ شعر سنائے ؂ غ

کمیٹی کل ہوئی برگیڈ میں میں خاموش بیٹھا تھا
طلب میں اپنے حصے کے ہراک ممبر نے منہ کھولا

کمیٹی جب ہوئی برخاست اور حصہ ملا سب کو
چھ ماشے سونا ہراک کو ملا اور مجھ کو اک تولا

کہا صاحب نے یہ انعام دوہرا تم کو ملتا ہے
سبب یہ ہے کہ تم چپکا رہا اور کچھ نہیں بولا

فرمایا: مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ وفا کیش لوگ حکومت کی کھلی ہوئی ثنا و صفت کرتے ہیں اور علانیہ اشتراکِ عمل کا ثبوت دیتے ہیں مگر حکومت ان کی ہمدردی کو اتنا خیال میں نہیں لاتی جتنا ان خموش اور ذہین لوگوں کا لحاظ کرتی ہے جو اعتراضات سے زبان رو کے ہوئے ہیں جیسے ڈاکٹر شاہ سلیمان۔ حکومت ایسے لوگوں کی خموشی کو اپنی بڑی اعانت سمجھتی ہے کہ اگر یہ بھی موتی لال و جواہر لال بن جائیں تو خدا جانے کیا قیامت ڈھائیں۔ ان خیالات کو اپنے ان تین اشعار میں نظم کر دیا ہے میں نے عشرت حسین کو لکھا تھا کہ ان خیالات کو شایع کرنا مناسب ہے یا نہیں لیکن انھوں نے نہ معلوم کیا سمجھ کر کچھ جواب نہیں دیا۔ آپ مشورہ دیجیے کہ ان کو شایع کروں یا نہیں۔ میں نے کہا آپ نے جو مضمون زبانی بیان فرمایا وہ اوّل تو فی بطنِ شاعر ہے، اشعار سے یہ تمام و کمال ظاہر نہیں ہوتا اور کچھ ظاہر بھی ہوتا ہے تو ایسی بے ضرر تنقیدیں تو آپ حکومت پر اس سے قبل بھی کر چکے ہیں۔ ۱۹۱۱ء میں تبدیلِ سلطنت پر آپ نے کہا تھا ؎

قدم انگریز کلکتہ سے دہلی میں جو دھرتے ہیں
تجارت خوب کی اب دیکھیں شاہی کیسے کرتے ہیں

Mill

نل کا آٹا ہو نل کا پانی ہو   اب دو آبلے پہ حکم رانی ہو

۱۹۱۲ء میں پانی کے نل بند ہونے کے باعث رعایائے دہلی کو سخت تکلیف محسوس ہوتی تھی تو کہا تھا حکومت نے رعایا کے دانے پانی دونوں پر قبضہ کر رکھا ہو۔ مجھے ان برگیڈ والے اشعار میں معمولی تنقید و مذاق معلوم ہوتا ہو بلکہ غور فرمائیے تو اس میں گورمنٹ کی تعریف نکلتی ہو کہ لائق اور غیر جذباتی معاملہ فہم اور کم گو اشخاص اس کے صلے سے محروم نہیں رہتے، ہر پیش بیں حکومت کو یہی کرنا چاہیے۔ فرمایا: نہیں آپ کو مسٹن گردی کا حال نہیں معلوم ہو جس سے میں بہ مشکل نکلا ہوں۔ دیکھو اس شعر میں میں نے مسٹن صاحب کی سختیوں کی شکایت کی ہو ؎

ہو منع ملاقات مری ہم نفسوں سے
فریاد کا موقع نہیں فریاد رسوں سے

مگر خیر میں نے بھی اپنے ستائے جانے کا مسٹن صاحب سے یہ کہہ کر رنج کم کر لیا ؎

خانۂ دل کو مرے توڑا تو کیا ایسی نمود
چشم بد دور آپ تو ہیں مسجدیں ڈھائے ہوے

اشارہ کان پور کی مسجد کی طرف ہو۔ غرض کہ ؎

رکھتی ہیں پھونک پھونک کے باتیں مری قدم
تیغ زباں نہیں ہو عصائے زباں ہو اب

کون پھر سوال جواب کی مصیبت میں پڑے، ان اشعار کو شایع کرنے میں ابھی عجلت نہیں کرنی چاہیے۔ اچھا خیر یہ شعر سنیے ؎

جھکا سکتا ہوں میں سر کو زباں کو روک سکتا ہوں

جواب اس کا مگر کیا ہو کہ تو کافر نہیں دل سے

دیکھو یہ شعر میں نے مرگِ ہاشم پر کہا تھا ؎ غ

دل ہی کو غم نہیں کہ ہوا مبتلاے غم
غم بھی بلا میں ہو کہ ہوا مبتلاے دل

فرمایا: عشرت میاں نے ایک فلسفے کی انگریزی کتاب دی تھی، اس کے مطالعے کے بعد ایک خیال کو یوں نظم کیا ہو ؎ غ

رنج آسماں میں ہو نہ راحت زمیں میں ہو
اپنے ہی حس کا جوش ہو سب کچھ ہمیں میں ہو

میں نے عرض کیا کہ اپنے ہی حس کے جوش کو میں نے یوں ادا کیا ہو ؎

دنیا ہو اپنی شکر و شکایت پہ منحصر
گلشن یہی ہو اور یہی زندانِ زندگی

رنج و راحت کا فلسفہ یوں عرض کیا ہو ؎

غم سے ناحق سب ڈرتے ہیں کچھ جوہر غم سے اُبھرتے ہیں
رنج و راحت دو بازو ہیں مالک کوئی بازو کم نہ کرے

فرمایا: اور شعر سُنو ؎

دلِ شکستہ میں اک سازِ دل نواز بھی ہو
لرز رہا ہوں میں جس سے اُسی پہ ناز بھی ہو

۷ار فروری سنہ ۱۹۲۰ء

میرے ایک خوش فکر دوست مولوی انجم احسن صاحب نگرامی ساتھ تھے، انھوں نے کسی کا یہ شعر سُنایا ؎

گل ملول افسردہ سبزہ شمع گل ہا بلبل اُداس   جی بھر آیا حالتِ گورِ غریباں دیکھ کر

کسی اور کا اچھے سے اچھا شعر ہوتا تو سید صاحب اس کی داد دینے کی بجائے سکوت اختیار فرمایا کرتے تھے مگر اس شعر کی دل سے داد دی فرمایا: میرا بھی ایک شعر ہے ٹکڑے بہت ملتے ہیں ؎

باغباں خاموش گل افسردہ اور گلشن اداس
جب ہوا بدلی تو ساری زیب و زینت اٹھ گئی

فرمایا: دیکھو میں نے اپنے ایک عزیز پر طعن کی ہے جو شیعہ ہو جانے کے بعد دوسروں سے بھی توقع رکھتے ہیں کہ اس کیش میں آجائیں ؎ غ

حضرت کی معاشرت بہت اچھی ہے — مشہور ہیں انتظام راحت کے لیے
اپنے مذہب میں کیوں بلاتے ہیں مجھے — جنت کے لیے کہ لطف صحبت کے لیے

فرمایا: سنی شیعہ کے فسادوں نے یہ اشعار کہلوائے ؎

کہاں دلوں سے شریعت کا کام چلتا ہے — فقط زباں سے بزرگوں کا نام چلتا ہے
ہوئی طریقِ بزرگاں کی پیروی مفقود — بس ان کے نام پہ لٹھ صبح و شام چلتا ہے

فرمایا: دیکھو امان سبھا کے ممبروں کا خیال آیا جو حکومت کے مداح و حمد ہیں ان کی نفسیات ان کی اپنی زبان سے ادا کی ہے ؎ غ

بتوں کی بات سے دل مائلِ فریاد ہوتا ہے
مگر کہنا ہی پڑتا ہے بجا ارشاد ہوتا ہے
مرے صیاد کی تعلیم کی ہے دھوم گلشن میں
یہاں جو آج پھنستا ہے وہ کل صیاد ہوتا ہے

انصاف یہ ہے کہ ؎

طلبِ جاہ پہ کہتے ہیں وہ کس کو مجبور
سچ تو یہ ہے کہ ہمیں لوگ غضب کرتے ہیں

۱۹ ر فروری ۱۹۲۰ء

ترکی کی تباہی کے سلسلے میں فرمایا کہ مسلمانوں نے خود تو مقامات مقدسہ فتح کرا دیے اب ڈیپوٹیشن لے کر ولایت پہنچے ہیں۔ میں نے اسی پر کہا ہے ؎ غ

بھائی کی ٹانگ توڑتے ہیں　　غیروں کے ہاتھ جوڑتے ہیں

اور سنو غ

ہیں وفد اور اپیلیں فریاد اور دلیلیں
اور کبر مغربی کے ارماں نکل رہے ہیں

اصل یہ ہے کہ یورپ کی سینکڑوں برس کی تمنّا اب پوری ہوئی کہ اسلام ان کی آستان بوسی کرے تھوڑی دیر غور کرکے فرمایا ؎ ع

خیر ہو قبلے کی لندن کی طرف بھاگے تو ہیں

دوسرے مصرع کی فکر میں رہے مگر نہ ہو سکا۔ فرمایا: دیکھو اس خیال کے تحت کہ اب مسلمان اہلِ یورپ سے تنگ آکر ہنود سے میل کرنا چاہتے ہیں ایک دیہاتی کی زبان سے کیا اچھّا مصرع آیا ہے ؎ غ

روٹھ کر اُن سے میاں ہم سے گلے لاگے تو ہیں

فرمایا کہ گاندھی ہندو مسلم اتحاد چاہتے ہیں مگر ہندو ابھی مسلمانوں سے میل کرنے میں کھٹکتے ہیں۔ میں نے اس خیال کو ایک لالائن کے منہ سے یوں ادا کرایا ہے ؎ غ

جان اُن کی کہیں ترکِ موالات نہ مارے
ڈرتی ہوں کہیں تُرک مُوا لات نہ مارے

۲۶ ر فروری ۱۹۲۰ء

فرمایا: سرسید نے چندہ کی بھیک کو فیشن میں داخل کر کے نہایت تکلیف دہ حد تک وسیع کردیا ہے۔ کل چند خوش پوش اصحاب ایک ڈیپوٹیشن کے سلسلے میں تشریف لائے تھے کہنے لگے : سرزمینِ حجاز میں یہاں سے جاکر سیکڑوں حاجی بیمار پڑ جاتے ہیں، وہاں اُن کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ آخر میں اُن کی خبر آتی ہے۔ اس لیے ہم نے ایک کمیٹی بنائی ہے کہ ہندستان سے اطبّا وہاں روانہ کیے جائیں کہ وہاں حاجیوں کو تکلیف اور موت کے چنگل سے بچاسکیں۔ آپ کے پاس اسی لیے حاضر ہوئے ہیں کہ اس کارِ خیر میں کچھ شرکت فرمائیں۔ میں نے کہا کہ یہ کارِ خیر ہے یا کارِ معصیت؟ آپ کو کس نے صلاح دی کہ اس گناہ میں خود بھی شریک ہوں اور دوسروں کو بھی لپیٹیں۔ اجی ہر نیک دل حاجی کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ سرزمینِ پاک اس کے جسم کو قبول کرلے اور اس کا حشر و نشر اس خطّۂ مقدّس سے ہو جہاں حضور سرورِ کائنات آسودہ ہیں۔ آپ حجاج کی اس سعادت میں حائل ہونے والے کون؟ اللہ اللہ کیجیے، گھر میں بیٹھیے۔ دنیا کو اس معصیت میں شرکت کی دعوت دیتے نہ پھریے اور مجھے معذور رکھیے۔ یہ سن کر اراکین وفد تھوڑی دیر تک میرا منہ دیکھتے رہے پھر کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی خاموشی سے واپس چلے گئے۔ میں نے انھی مواقع کے لیے کہا ہے ؎

قوم غریب تنگ ہے چندوں کی مانگ سے
کالج کے چیونٹے لپٹے ہیں ٹیڑی کی ٹانگ سے

۲ر مارچ ۱۹۲۰ء

ایک بڑی ڈبل روٹی لے کر حاضر ہوا۔ جو میں نے کٹرے میں سید

صاحب کے لیے تیار کرائی تھی۔ دیکھ کر خوش ہوئے کہنے لگے اتنی بڑی ڈبل روٹی! یہ تو اچھا خاصا کسی یوربین کا چوتڑ ہے مگر زرا سا سانولا ہے ڈبل روٹی کے بالائی حصّے کی سرخی کو آنچ نے کچھ ماند کر دیا تھا، خیر کوئی ہرج نہیں۔ آپ کو میرا وہ شعر تو یاد ہوگا ؎

کاش کر لے مجھے وہ شاہدِ ہوٹل منظور
کیک تو روز ہے اک رات تنجن بھی سہی

میں نے عرض کیا یہ سب پیٹ بھرے کی باتیں ہیں۔ ورنہ بقولِ ذاکر غازی آبادی ؎

بھوکے عاشق کے واسطے ذاکر — گال سے شیرمال اچھا ہے
نہیں تخصیص زلف کی کوئی — آپ کا بال بال اچھا ہے

اس سلسلے میں کسی اور ہزل گو کی تشبیہ بھی دیکھیے ؎

تھی جوانی میں جو سیڈم نان پاؤ
اب بڑھاپے میں ملائی ہوگئی

۱۰ مارچ ۱۹۲۰ء

آج بہت افسردہ خاطر پایا۔ میں نے پوچھا تو معلوم ہوا بھرے بیٹھے تھے۔ تیزیٔ حس انسان کے لیے عذاب ہے وہ بھی ان جیسے ذکی شاعر کی، عشرت حسین صاحب اب اس حالت میں ان کی دنیا تھے۔ اپنی محبّت و سعادت سے ان کا دل اپنے ہاتھ میں لیے رہتے تھے۔ مگر آج سیّد صاحب اپنے بعض اعزّہ و اقربا کے خلاف آگ برسانے لگے۔ کہیں تحریک یہ کر دی گئی تھی کہ آپ الہ آباد چھوڑ کر پریانواں میں رہیے۔ اس پر کہنے لگے کہ بدخواہوں کی خوشی یہ ہے کہ میں الہ آباد چھوڑ دوں

ان لوگوں کو ہرگز یہ منظور نہیں ہو کہ میرے ایک ناکارہ وجود کے باعث عشرت منزل اتنی بڑی کوٹھی رُکی رہے، میری موت کی دعائیں مانگتے ہیں اور ترکیبیں سوچتے ہیں کہ اسے خالی کردوں ۔ لیکن میں کیا کروں موت میرے اختیار کی بھی تو نہیں اور مجھے اب زندگی میں لطف بھی کیا ہو ؎

بوڑھوں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں
لیکن نہ موت آے تو بوڑھے بھی کیا کریں

میں نے کہا آپ کیوں دل کو خون کیے ڈالتے ہیں ۔جب آپ نہیں چاہتے تو عشرت حسین بھی کبھی نہ چاہیں گے ۔ زندگی بھر آپ سے عشرت منزل کوئی نہیں چھڑا سکتا ۔حضرت سرمد کی رباعی سُنیے ؎

رباعی

مرگ است دراین بادیہ دُنبال ترا — این است مآلِ کار از مال ترا
اوّل محنت وآخرش حسرت ہست — این مال کند ہمیشہ پامال ترا

فرمایا: سچ ہو، افسوس ؎

جان دینا منع ہو اور دل سے غم ٹلتا نہیں — سانس لیتا ہوں مگر کام اس سے کچھ چلتا نہیں
تپتے ہونے سے نہ سمجھو یہ کہ میں راحت میں ہوں — دل میں انگارے بھرے ہیں گو بدن جلتا نہیں

میری حالت اس زندہ مگر کچلے ہوئے کیڑے کی سی ہو جس کو چیونٹیوں نے کھانا شروع کر دیا ہو۔ وہ کہتا ہو ارے ابھی مجھ میں جان اور حس ہو، ذرا ٹھہر جاؤ، میں بے جان ہو جاؤں تو کھا لینا ۔ مگر چیونٹیاں اس کو جواب دیتی ہیں کہ چلو بیٹھو، تم اب نہ مرے چند منٹ بعد مرجاؤ گے تمھارے مرنے کے انتظار میں یہاں اپنی دعوت کون ملتوی کرے؟

عقرب طینت اقربا کی اسی نیش زنی نے مجھ سے یہ شعر کہلوائے ؎

وہ چاہتے ہیں اس کو دم دے کے میں بلاؤں
یاں دل میں یہ ٹھنی ہی مرجاؤں اور نہ جاؤں
اظہارِ عقل میں ہیں احباب گرمِ کوشش
اور مجھ کو فکر یہ ہی اپنا جنوں چھپاؤں
سازِ طرب ملا کر بیٹھے ہیں سننے والے
پھر میں فسانۂ غم کیوں کر انھیں سناؤں
میری طرف سے کیوں وہ مایوس ہو رہے ہیں
بیمار تو پڑا ہوں ممکن ہی مر بھی جاؤں

۲۸ مارچ ۱۹۲۰ء

تعلیم کی خرابی کے سلسلے میں فرمانے لگے: اس کا مضر اثر ذکور سے زیادہ اناث پر پڑتا ہی ؎

Ready Lazy

اعزاز بڑھ گیا ہی آرام گھٹ گیا ہی — خدمت میں ہیں وہ لیزی اور ناچنے کو ریڈی
تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر — شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

میں نے عرض کیا کہ اس مضمون کو آپ کے رنگ میں میں نے بھی یوں رنگا ہی ؎

تمام شہر سے بی بی کا دوستانہ ہوا
کلب ہوا مرا گھر یا غریب خانہ ہوا

فرمایا: مردوں پر تعلیم کا اثر دیکھو ؎

خواہانِ نوکری نہ رہیں طالبانِ علم — قائم ہوئی ہی رائے یہ اہلِ شعور کی
کالج میں دھوم مچ رہی ہی پاس پاس کی — عہدوں سے آ رہی ہی صدا دُور دُور کی

اور سُنو ؎ غ

بہارِ عمر گزری سالہا سے امتحانی میں
ہمیں تو پاس ہی کی فکر نے پیسا جوانی میں

تھوڑی دیر بعد فرمایا: دیکھو کیا اچھا مصرع آیا ہے۔ ع غ

پہلے بی اے تھے اور اب بیمار ہیں

میں نے کہا خوب ہے دوسرا مصرع بہم پہنچائیے۔ مگر دوسرے مصرع کی فکر کے بجائے ان کا نکتہ رس ذہن اسی مصرع کے ساتھ کھیلتا رہا کہنے لگے "بیمار" میں بی کو Bee سمجھو یعنی شہد کی مکھی، اس کے ساتھ "مار" لگادو بیمار کے معنی ہو جاتے ہیں۔ مکھی مار یعنی بے کار۔ یہی وجہ ہے کہ ؎

ہیں عمل اچھے مگر دروازۂ جنت ہے بند
کر چکے ہیں پاس لیکن نوکری ملتی نہیں

ممبری و کمیٹی کے تذکرے پر فرمایا ؎

کمیٹی میں چندہ دیا کیجیے ترقی کے ہجے کیا کیجیے

فرمایا کمیٹی کے ایک نئے معنی میرے ذہن میں آئے ہیں۔ میں نے کہا: وہ کیا؟ فرمایا کمیٹی کے معنی ہیں "بیا و بخور" میں نے کہا وہ کیسے؟ فرمایا: کمیٹی مرکب ہے 'کم' Come اور 'ایٹ' Eat سے۔ 'کم' کے معنی 'بیا' اور 'ایٹ' کے معنی 'بخور'۔ 'ایٹی' میں "ی" نسبتی ہے یہی لوگ ہیں جو دعوتیں بھی کھایا کرتے ہیں اور روپیہ بھی۔ ع غ

ہے قوم تو بے پر مگر اڑتا ہے زرِ قوم

۳۰ مارچ ۱۹۲۰ء

فرمایا: ہماری بڑی نادانی ہو کہ آپس میں ذرا ذرا سی بات پر فوقیت جتاتے ہیں۔ انتہا پسند کہتے ہیں ہم اچھے ہیں؛ اعتدال پسند کہتے ہیں ہم اچھے ہیں۔ علی گڑھ والے کہتے ہیں ہم اچھے ہیں؛ ندوہ والے کہتے ہیں ہم اچھے ہیں۔ حالانکہ حقیقت دیکھو تو سب برطانوی معدے میں کیلوس بن رہے ہیں۔ ہماری بالکل وہی حالت ہو جو مختلف غذاؤں کی انسانی پیٹ میں ہوتی ہو۔ گیہوں کہتا ہو میں اچھا ہوں۔ چاول کہتا ہو میں اچھا ہوں، فیرنی کہتی ہو میں اچھی ہوں، لڈو کہتا ہو میں اچھا ہوں۔ ان سب کی کمیٹی دیکھ کر معدہ کہتا ہو: رات بھر جو چاہے خود ستائی کرلو، اتنا تو میں جانتا ہوں کہ صبح تم سب کو بھنگن لے جائے گی۔ ہائے ؎

کہوں کس کو یہ وقعت میں زیادہ اور یہ کم ہیں
ہر اک ذرّے کو دعویٰ ہو کہ ہم بھی جزوِ عالم ہیں

سید صاحب کی یہ تشبیہ کئی دن تک دماغ میں ایک کیفیت پیدا کرتی رہی آخر میں نے اس کو یوں نظم کر دیا ہو ؎

پیٹ میں ہوتی رہی ایک کمیٹی شب بھر — بحث کرتی رہیں آپس میں غذائیں اکثر
کہا چاول نے میں ہوں عام غذائے عالم — سارے غلّوں میں نہیں کوئی بھی مجھ سے بہتر
بولا گیہوں تو غذا ہو کہ نرا پانی ہو — میری طاقت ہو مسلّم نہ بہت بک بک کر
جب چنے نے یہ مُناظِش میں آ کر بولا — زور و طاقت میں تو تم دونوں سے میں ہوں بڑھ کر
مجھ میں طاقت کے سوا لذت ارزانی ہو — ان محاسن کے ہیں شاہد دہنِ اسپ و بشر
کئی اقسام کی بنتی ہو مٹھائی مجھ سے — جانتا ہو مجھے ہر صاحبِ لذّات و نظر
سن کے فیرینی بڑھی اور چنے سے بولی — یہ تو تھا میری فضیلت کا سراسر دفتر
میری خوبی کی ہو یہ ایک دلیلِ ادنیٰ — لوگ کھاتے ہیں مجھے پیٹ بھرا ہونے پر

پُرشکم ہونے پر تجھ کو جو لگائے کوئی منہ پھر ترا نام نہ لے پیٹ میں وہ ہو غرغر
سُن کے فیرینی سے بولا یہ چپاتی جل بھن کر میں اگر باعثِ غرغر ہوں تو تو صفر اگر
حسن ہی دیکھا برائی پر کبھی کی نہ نظر جبھی رکھتے ہیں تجھے مور و مگس بھنکا کر
الغرض جب نہ ہوا طے کہ ہے افضل ترکون سب نے معدے سے کہا تو ہی یہ جھگڑا طے کر
بولا معدہ میں عمل سب پہ کروں گا یکساں میرے نزدیک تو سب ایک ہیں گھوڑا ہو کہ خر
شب ابھی باقی ہے بن لو میاں مٹھو کچھ دیر صبح ہو جائیگی تو لے جلائے گا سب کو مہتر

میں اک افسر ہوں میں صوفی ہوں میں عالم ہوں میں سیٹھ
سب کو مارا اسی اغوائے فضیلت نے قمر

۷ راپریل ۱۹۲۰ء

الہ آباد کے محکمۂ نشر و اشاعت کے کمشنر مسٹر گوج کی چھٹی آنے کا حال بیان کیا کہ لکھا ہے کہ جو اشعار نان کوآپریشن Non cooperation کے خلاف کہے ہوں، وہ روانہ کیے جائیں۔ فرمایا: پنشن کی اجرت میں ایسی خدمت چاہی جا رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ابھی تک ایسے اشعار نہ کہے ہوں تو کہو یا کم از کم نان کوآپریشن کی موافقت میں کچھ نہ ہو۔ فرمایا: دیکھو میں نے انھی خیالات کو یوں نظم کیا ہے ؎

بھرتے ہیں میری آہ کو فونوگراف میں کہتے ہیں فیس لیجیے اور آہ کیجیے

آج کل اس انجمن کے کچھ عجب اسلوب ہیں میں جو کہتا خوب ہوں وہ چپ بھی کرتے خوب ہیں

فرمایا: ترکِ ملازمت کے بارے میں میرا خیال ہے کہ یہ عام طور پر قابلِ عمل نہیں ہے اور جن سے ممکن ہو وہ کریں۔ ترکِ ملازمت میں زیادہ زور اس پہلو پر دیا جانا چاہیے کہ لوگ ان محکموں میں ملازمتیں نہ کریں

جن سے ملک و ملت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے۔ میں نے اسی پر کہا ہے ؎

قدرتِ سیر جو حاصل ہو تو دیوار نہ بن
پنجۂ غیر میں رہنا ہو تو تلوار نہ بن

فرمایا: دیکھو میں نے ان اشعار میں دفعہ ۱۴۴ کی زبان بندی کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

زیادہ گوئی سے اب ہم اسی سے رکتے ہیں — جو خوب کہتے ہیں اکبر وہ کم بھی چکتے ہیں

زمانہ جانبِ انصاف ڈھل ہی جائے گا — غ — زبان بند کرو حال کھل ہی جائے گا

۱۳ اپریل ۱۹۲۰ء

متعدد اشعار سنائے۔ جب اس شعر پر آئے ؎

پاشپ کوئی کھلا نہیں گھر میں لگی ہے آگ
اب بھاگنا ضرور ہوا غور کیا کریں

تو فرمایا کہ تھوڑا عرصہ ہوا کہ چوک کی دکانوں میں آگ لگی۔ اس وقت پ بند ہونے سے رعایا کا سخت نقصان ہوا۔ میں نے مذکورہ شعر اس خیال سے متاثر ہو کر کہا تھا۔ کیا کہا جائے۔ صاحب کی۔

آب و دانے پہ حکمرانی ہے

اگر اس وقت زمانہ سابق کی طرح کنوئیں ہوتے تو آگ بروقت قابو میں لائی جا سکتی تھی۔ شہروں میں ترمیم دیکھو کہ حکمراں طبقہ اور امرا سول لائن میں ہیں۔ غربا کے لیے زیست کے دن گزارنے کے واسطے شہر کے گندے گوشے علیحدہ ہیں۔ مراد اس سے یہی ہے کہ امیر و غریب نہ یک جا ہوں گے

نہ ایک دوسرے کے دُکھ درد سے ہمدردی ہوگی۔ اس کمی خلوص و محبت سے
'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کے مسئلے کو تقویت پہنچتی ہے۔ شعر سنایا ؎

جو خوش کرے گا چاہے گا مجھ کو بھی خوش کرو
دنیا میں بے غرض کوئی راحت رساں نہیں

پھر فرمایا: نہیں دوسرا مصرع اس طرح بدل دینا چاہیے۔ ع

اس کو سمجھ کے تو کوئی منت قبول کر

سیّد صاحب ایک چھوٹا گاڑھے کا تہمد باندھے بیٹھے تھے۔ مچھروں نے پیروں میں کاٹا تو طفیل ملازم سے کھجانے کے واسطے کہا۔ کھجاتے کھجاتے طفیل کا ہاتھ ایک گلٹی پر پڑ گیا جو گھٹنے کے قریب بہ صورتِ بدگوشت تھی۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "ای ہی" اس سے پوچھا کیا ہوا۔ اس نے کہا آپ کے پیر میں پھوڑا ہے۔ یہ سن کر خود بھی بولے "ای ہی" اُس نے دریافت کیا: کیا دُکھ گیا؟ فرمایا نہیں، مگر تو نے کہا "ای ہی" میں سمجھا شاید دکھ گیا ہوگا۔ اس لیے میں نے بھی کہہ دیا ای ہی۔ مجھ سے فرمایا یہ بدگوشت میرے ایک زمانۂ دراز سے ہے، اس میں کوئی حس نہیں ہے۔

فرمایا یورپین عورتوں کی ترقی کی تقلید ایشیائی عورتیں بھی کرنا چاہتی ہیں میں نے اس پر کہا ؎

سایہ مدت ہوئی غبارہ بنا　　پائنچوں میں بھی اب بھری ہے ہوا

دریافت فرمایا: بی بی کو راضی رکھنے کا نسخہ آپ کو معلوم ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ فرمایا: بی بی اگر نئی روشنی کی ہے تو اس کے چال چلن پر اعتراض نہ کرو اور اگر پرانے خیال کی ہے تو اپنا چال چلن درست

رکھو، ہمیشہ زندگی اچھی کٹے گی۔ میں نے عرض کیا: خوب ؎

شعرِ اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں
دل پہ گزری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

۲۲ر اپریل ۱۹۲۰ء

فرمایا: دیکھو میں نے اپنے خیالات چھپانے کی وجہ اس شعر میں ظاہر کی ہے ؎

کھولی نہیں زبان کبھی فریاد کے لیے
آواز کیوں نشانہ ہو صیّاد کے لیے

میں نے کہا: میرے شاگرد افغان پرنس سردار محمد عمر خاں صاحب اپنے والد سردار محمد ایوب خاں صاحب کے متعلق فرماتے تھے کہ ان کی قادر اندازی کا یہ حال تھا کہ تلوار کی دھار پر گولی مارکر گولی کے کٹے ہوئے دونوں ٹکڑے برابر تول کر بتا دیتے تھے۔ سرحدی پٹھانوں کے متعلق سنا تھا کہ شب میں سگریٹ کی روشنی پر فیر کرکے دشمن کے منہ میں گولی اتار دیتے ہیں۔ آپ کا صیّاد قادر اندازی میں ان لوگوں سے بڑھا ہوا ہے کہ محض آواز پر بے خطا نشانہ لگاتا ہے۔ فرمایا: اور سنیے ؎ غ

اک غل مچا کہ اس پہ بھی لیبنس ہے ضرور
منہ کھل چکا تھا ورنہ مرا آہ کے لیے

فرمایا: دیکھو افغان شہزادے بہت پسند کریں گے میں نے فارسی کے دو اشعار سے ایک حکومت دوست وزیر کی یوں دعوت کی ہے، وہ خود اپنی زبان سے کہتا ہے ؎ غ

برائے من بہ سرِ تختِ خویش جا کردی　　دلِ حریصِ مرا غافل از خدا کردی

مراست نازو تبختر کہ زر بدست آمد   تراست خندہ وبازی کہ خر بدست آمد

میں نے کہا آپ کی مراد غالباً . . . . صاحب سے ہے۔ بہت خوش ہوے۔
فرمایا: ماشاء اللہ آپ خوب پہنچے۔ دیکھو اس خیال نے ایک شعر اور یاد دلایا اکثر اہلِ ملک اس کا تصفیہ نہ کر سکے کہ گاندھی کے ساتھ ہوں یا صاحب کے کیمپ میں جائیں ان کو میرا مشورہ یہ ہے ؎ غ

پر ہو تو اوج ڈھونڈو خر ہو تو گھاس دیکھو
ہم کیا بتائیں تم کو اپنی نکاس دیکھو

فرمایا: حکومت اور قوم دونوں کو جو خوش رکھنا چاہتے ہیں ان کے متعلق اظہارِ خیال دیکھیے ؎ غ

اونٹ میں سروس بھی ہے انوارِ ایمانی بھی ہیں
آپ کسریٹ میں بھی ہیں نذرِ قربانی بھی ہیں

میں نے عرض کیا کہ میں نے بھی اس بات کو "ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں" ایک تمثیل کی مدد سے یوں ظاہر کیا ہے ؎

رب مل چکا اگر ہوسِ بت نہ جائے گی
پتھر کی ناؤ کیسے کنارے لگائے گی

فرمایا کہ اہلِ ہنود نے گائے مفید ہونے کے باعث اس کو مرکزِ مقدس تک پہنچا دیا اور معبود اور ماتا بنا دیا نیز مسلمانوں سے فتوے لینے لگے کہ گائے کو حلال نہ کیا جائے چنانچہ ؎ غ

نکلا ہے یہ کچھ روز سے فتوائے نیرِ قوم
گایوں کو جو کھاتا ہے وہ بیشک ہے خرِ قوم

میں کہتا ہوں کہ اگر ہندستان میں گائے بہت مفید ہے تو عربستان میں

اونٹ ۔ اونٹ کو اپنی خدمت کے مدِنظر مسلمانوں سے یہ شکوہ ہو کہ انھوں نے اپنے ہندو بھائیوں کی طرح اُس کی آرام رسانی کی کچھ داد نہ دی۔ میں نے اس پر کہا ہو ؎ غ

چھوٹیں جو گائے ماتا حسرت سے اونٹ بولے
افسوس شیخ جی نے ہم کو پتا نہ سمجھا

فرمایا دیکھو اس خیال کو کہ مذہب اور بزرگوں کو گالیاں دینے کا سبق طلبا کو اہلِ یورپ نے سکھایا ہو اس طرح ادا کیا ؎ غ

باقی نہیں دلوں میں اللہ کا ادب کچھ
یہ نازنیں جماعت غائب کرے گی سب کچھ

فرمایا: قدامت پسندی پر ایک شعر اور سنیے ۔ غ

بے فائدہ ہو اکبر اب تم کو شوق اس کا
سائنس کی سڑک میں جنت بھی آگئی ہو

فرمایا ذرا اس شعر کو عارفانہ رنگ میں دیکھیے ؎ غ

ابھارا تھا بہت ای جانِ جاں شوقِ رسائی نے
مگر ہمّت نہ بندھنے دی تری دیر آشنائی نے

اس مضمون کا کسی اور کا شعر بھی کیا خوب ہو ؎

زمانہ چاہیے دل کو کہ حاصل ہو نیاز اس کا
بہت دیر آشنا ہو ای جبینِ شوق ناز اس کا

۲۷ر اپریل ۱۹۲۰ء

احباب میں سے کسی نے مشورہ دیا تھا کہ سید صاحب خان بہادری کا خطاب واپس کر دیں۔ کہنے لگے کہ یہ خطاب مجھ کو گورنمنٹ نے جوڈیشل

سروس کے صلہ میں دیا ہے، اگر میں اس کو واپس کردوں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ میری ایمان دارانہ خدمات عدالت کا جو اعتراف کیا گیا ہے میں اس سے ناراض ہوں اس طرح دنیا کو یہ سمجھنے کا موقع دوں کہ میں نے عدالتی خدمات بے ایمانی اور ناانصافی سے انجام دی تھیں۔ تو کوئی صاحب اچھا مانیں یا بُرا نہیں خطاب واپس کرکے بے ایمان مشہور ہونے کو تیار نہیں ہوں سنتا ہوں کہ اپنا خطاب حاذق الملک حکیم اجمل خاں صاحب نے واپس کر دیا۔ اگر ایسا کیا تو انھوں نے ایک فعلِ عبث کیا۔ میں نے پوچھا: وہ کیسے؟ فرمایا اس خطاب کے دو اجزا ہیں۔ حاذق الملک۔ تو اجمل خاں صاحب کا یہ کہنا کہ میں نے حذاقت واپس کردی ایک مہمل سی بات ہے وہ حاذق طبیب اب بھی ہیں۔ رہا دوسرے ٹکڑے یعنی ملک کے واپس کرنے کا اعلان تو ملک پاس تھا ہی کب جو واپس کردیا۔

اجی صاحب بات یہ ہے کہ گورمنٹ سے مقابلے کی مجھ میں جان نہیں ہے میں پنشن خوار ضرور ہوں مگر آلۂ سرکار نہیں ہوں اس کو میں نے صاف ظاہر کردیا ہے

شاگردِ ڈارون تو خدا ہی نے کردیا ۔۔۔ اکبر مگر نہیں ہے مداری کے ہاتھ میں

آج کل اللہ اللہ کرنے والے مسلمانوں کی جان عجیب ضیق میں ہے۔ وہ حکومت کے شدائد کا مقابلہ کریں یا مغرب زدہ لوگوں کے عقائد کا۔ اقبال صاحب نے حافظ اور تصوف کے خلاف ایک علیحدہ مورچہ قائم کیا ہے۔ میں نے انھی خیالات سے متاثر ہو کر کہا ہے ؎

لیڈر کو دیکھتا ہوں تصوّف پہ معترض ۔۔۔ کالج کے کیڑے پڑ گئے دلقِ فقیر میں

تمھاری شاعری یہ پھلجھڑی ہے یا پٹاخا ہے ۔۔۔ یہ حافظ ہی کی محفل ہے جہاں کا سادہا قا ہے[1]

سُنا ہے کہ مہاتما جی بنارس میں فاقے کرکے مخالفین کو مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ

---

[1] یعنی چھلکتا پیالہ۔ کلام پاک کا ٹکڑا ہے۔

ان کی بات مانی جائے تو صاحب تپشیا کرنے سے نہ کسی کو آج تک سوراج ملا ہے نہ ملے یہ کہہ کر کہ ہم مرجاب ہم جیو دیب "حکومت کو کیا ڈرا سکتے ہیں۔ اجی ؎

یا فلسفہ ہے تیغ کا یا ہے سکوت کا　　　باقی جو ہے وہ تار ہے سب عنکبوت کا

کوئی عرب کے ساتھ ہو یا ہو عجم کے ساتھ　　　کچھ بھی نہیں ہے تیغ نہ ہو جب قلم کے ساتھ

زورِ بازو[1] نہیں تو کیا اپیچ　　　ہاتھ بھی دے خدا زبان کے ساتھ

میں نے اس موقع پر کہا ہے ؎

یہ دال اب گنگ (بنارس) تو اب گل نہیں سکتی　　　کلّو کے پٹاخے سے بلا ٹل نہیں سکتی

۵ر مئی سنہ ۱۹۲۰ء

فرمایا اس شعر میں حسن التعلیل کا لطف دیکھیے ؎

تا بہ سینہ گردنیں جھکنے لگیں تسلیم کو　　　درد اٹھتا ہے خیالِ یار کی تعظیم کو

فرمایا: میں نے آپ کو اپنی وہ نظم اب تک نہیں سنائی جو جرمنی کی جانب سے بلجیم پر فوج کشی پر لکھی ہے اب اس وقت یہاں موجود نہیں ہے پھر کسی دوسرے موقع پر سناؤں گا۔ درد کے اٹھنے پر اس کے ایک شعر کا خیال آیا۔ گولہ باری سے بلجیم کی حالت دکھائی ہے ؎ غ

کس کی طاقت تھی کہ گولوں کی نہ عزت کرتا　　　گردبن کر صفِ ہستی سے بیاباں اُٹھا

میں نے عرض کیا: میرا ایک شعر ہے ؎

اے دل سببِ ننگ ہے اس بزم کی شرکت　　　جز درد نہ کوئی واں تری آمد پہ اٹھا بھی

---

[1] سنا ہے کہ حال میں سولینی سے اس کے ایک دوست نے کہا: آپ کی ہر تحریک ایسی ذرائی ہوتی ہے کہ بغیر کامیاب ہوئے نہیں رہتی اس نے جواب دیا میرے الٹے ہاتھ کے پرچۂ تحریک میں وزن اس ڈنڈے کی وجہ سے بڑھ جاتا ہے جو میرے سیدھے ہاتھ میں رہا کرتا ہے۔

اور مومن خاں نے غضب ہی کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎
محفل میں میرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ   بدنامیِ عشاق کا اعزاز تو دیکھو
سید صاحب کسی کے شعر کو کم خیال میں لانے والے تھے اس شعر کی بے اختیار تعریف کی۔ میں نے عرض کیا آپ کا یہ شعر بھی خوب ہے ؎
مجلسِ نسواں میں دیکھو عزتِ تعلیم کو   پردہ اٹھا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو
نوٹ بک دیکھ کر چیستاں سنائی ؎ غ
جمن کے سر پہ ہند کا غلہ سوار ہے   مخفی ہے انجمن میں مگر آشکار ہے
میں نے کہا میں نہیں سمجھا۔ فرمایا۔ جمن کے سر پر "ان" یعنی غلہ لگا دو تو انجمن ہو جاتا ہے میں نے عرض کیا اس قسم کی سطحی طفلانہ کوششوں کو کلام سے نکال ڈالیے۔ آپ کے سخن کی عظمت و عمق پر حرف لاتی ہیں فرمایا خیر یہ آپ کو پسند نہیں تو دوسری چیستاں سنیے ؎
ممکن نہیں عبور رہے ان کے راز پر   بالفعل ہے مقام عدالت جہاز پر
میرے سکوت پر فرمایا آپ نے غور نہیں کیا اس کا حل Courtship ہے۔ میں نے عرض کیا میرے نزدیک یہ بھی بہت دور از کار طفلانہ ہے فرمایا اچھا سہل معنے دیکھیے ؎
مر جائیں گے پر رکھیں گے ثابت قدم اپنا   ہے مرد میں جو دال کبھی گل نہیں سکتی

لیڈی تو ہے شوخ شرمگیں ہے بانو غ   بالیں ہر وقت یہ ہے وہ ہے بانو
No   Yes

برہمن دل میں اگر رام سے کہتا ہے کہ آ   بات یہ خوب ہے اک صورتِ آرام تو ہے
۲۷ مئی سنہ ۱۹۲۰ء

شہر کے عالم مولانا محمد کافی صاحب نے اپنے مدرسے کے ایک طالب علم حافظ عبدالمعبود صاحب سے کہہ دیا تھا۔ وہ عشرت منزل میں آکر نماز (بالخصوص مغرب کی) پڑھایا کرتے تھے۔ آج سید صاحب نے اپنی سبحان اللہ والی غزل اُن سے خوش الحانی سے پڑھ کر سنوائی۔ اس کے بعد حسب ذیل اشعار خود سنائے ؎ غ

نہ بحثوں میں الجھتا ہو دلیلوں میں نہ گھُستا ہو　　زبان عجز ہو اور لذّت اسمائے حسنیٰ ہو

فرمایا: ہم لوگوں کے منہ سے اگر کوئی بات منافیِ ادب نکل بھی جاتی ہو تو اعتراف و عجز و انفعال کے ساتھ ؎ غ

میں چاہتا تھا کہ ہستی سے کروں قطع نظر　　نہ ہو سکا مگر ایسا خدا کو کیا کرتا

قابلِ قدر طبیعت ہو ہماری اکبرؔ　　ہیں مصیبت میں اور اللہ سے خوش رہتے ہیں

حالتِ اکبرؔ کو دیکھو اللہ سے امید رکھ　　اس قدر مقبول اور ایسا گنہگار آدمی

فرمایا دیکھنا آدمی والی غزل میں مطلع کیا بے تکلّف آیا ہو ؎ غ

آج میں نے ان کے گھر بھیجا کئی بار آدمی　　جب سُنا تو یہ سُنا بیٹھے ہیں دو چار آدمی

۱۲ جون ۱۹۲۰ء

فرمایا "ہر کہ شمشیر زند خطبہ بہ نامش خوانند" سلطنت بغیر کافی جان و مال قربان کیے نہیں ملا کرتی۔ کسی کا "صاحب" سے غلامانہ عاجزی کے ساتھ یہ کہنا کہ حضور مجھے بادشاہ سمجھا کریں اپنی عقل اور اپنی قوم کی ہوا خیزی کرانا ہو تپشیا کرنے سے دینی مدارج مل جائیں تو مل جائیں سلطنت نہیں مل سکتی بالخصوص اس حالت میں کہ اب خود مہاتما جی کے جتھے میں تفریق ڈال دی گئی ہو اور انھی کے آدمی ان سے اختلاف کا اظہار کرتے ہیں ؎ غ

ہمارے ملک میں یہ زورِ اقبال فرنگی ہو　　کہ تن کو آپریشن میں بھی باہم خانہ جنگی ہو

سُنا ہے کہ مہاتما گاندھی کے خاص خاص دوست بھی مالی فوائد کے مدِ نظر حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے لگے ہیں میں نے اسی کا احساس کر کے کہا ہے کہ اس طرف حکومت کی سختی اور اس طرف آپس میں پھوٹ ۔ غ

سیٹھ گاندھی میں سانسیں غالباً رُکنے لگیں لکشمی بائی فرنگی کی طرف جھکنے لگیں

حکومت کو ستا قراس وقت کیا جا سکتا ہے جب آپس کے اختلافات دور ہوں ؎ غ

ہر ایک کا جہاں میں ارمان نکل رہا ہے تو بیں بھی چل رہی ہیں جوتا بھی چل رہا ہے

۱۵ / جولائی سنہ ۱۹۲۰ء

فرمایا دیکھو میں نے اس مغربی تہذیب پر طعن کی ہے کہ جوتا مارتے جاتے ہیں اور I beg your Purdon معافی چاہتا ہوں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں کہ کر بری الذمہ ہوتے جاتے ہیں ؎ غ

کی تھی پاپوش زنی جب ہوئی نالش دائر کہ دیا صلح کرو لیتا ہوں جوتا واپس

واپسی گو تھی زبانی ہوئی نالش ڈسمس ہوگیا کورٹ سے وہ شوخ اچھوتا واپس

میں نے کہا میں اس شوخ کی شوخی سے زیادہ آپ کی شوخی دیکھ رہا ہوں کہ مارا ہوا جوتا پھر واپس دلا رہے ہیں کہ دوبارہ سرکوبی کے کام آئے۔ سن کر مسرور ہوئے۔ فرمایا دوسری اقوام کے مذہبی و مدنی اختلافات ایک طرف خود مسلمانوں میں شیعہ، سُنّی، وہابی، بدعتی، بریلوی، دیوبندی جھگڑے کیا کم ہیں جو سب کو متحد ہونے دیں۔ میں نے اس پر کہا ہے ؎ غ

اختلافوں کے مہیا ہیں جو ساماں اتنے متفق ہو نہیں سکتے ہیں مسلماں اتنے

حکم صاحب نے دیا ہے کہ شرارت نہ کرو خبر اتنی ہے اور اخبار کے ساماں اتنے

میں نے اتنی اور اتنے کی بلاغت کی داد دی فرمایا کم زوری کے باعث روزہ نہ رکھ سکا اس کی معذرت سُنو ؎ غ

رمضاں میں جو رہا صوم سے محروم اکبر   سامنے اس کے بھی حلوا ہی مگر عید نہیں

الہ آباد کے محلہ دائرہ شاہ اجمل کے مولانا محمد فاخر صاحب کو ان کی بے لوث دینی

و قومی خدمت کی داد یوں دیتا ہوں ؎ غ

فاخر شلثوں (اہلِ تثلیث) سے شکوہ نہیں کرے گا

مرکز ہی دائرے کا جنبش نہیں کرے گا

دیکھو انگریزی قوافی میں کیا بے تکلف شعر نکلا ہی ؎ غ

بات کچھ ہو ہی گی لائڈ جارج میں   آج کل دنیا ہی ان کے چارج میں

۱۸ر جولائی ۱۹۲۰ء

فارسی شعر سنایا ؎ غ

زینت قصر نہ خواہد دلِ حسرت زدگاں   شجرے باشد و پائین مزارے باشد

میں نے تعریف کی فرمایا: اپنے افغان شہزادوں کو بھی سناتا وہ بہت پسند

کریں گے۔ دیکھو آج پیری میں یہ خیال ہی اور کل جوانی میں یہ تھا ؎

نیچر کو ہوئی خواہش زن کی اور نفس نے چاہا رشکِ پری

شیطان نے دی ترغیب کہ ہاں لذت تو ملے زانی ہی سہی

ممکن نہیں ای مس ترا نوٹس نہ لیا جائے   گال ایسے پری زاد ہوں اور کس نہ لیا جائے

Kiss

میں نے عرض کیا کہ میں نے اس نوٹس لینے سے نظر کو یوں روکا ہی ؎

حسنِ سرِ بازار کو کیا دیکھ رہا ہی   غافل تری نظروں کو خدا دیکھ رہا ہی

ایک دوسری جگہ نوٹس نہ لینے کو یوں عرض کیا ہی ؎

نا شہِ دل کو کہ لنظائیے سے آنکھیں پھیریں   اس نظر کو دیکھیے جس نے کہ دیکھا بھی نہیں

فرمایا: اس کے برعکس مضمون سنو ؎

جلوۂ ساقی دمی جان لیے لیتے ہیں   شیخ جی ضبط کریں ہم تو پیے لیتے ہیں

میں نے عرض کیا کہ میں نے اس مضمون کو بھی ادا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

سرمستیِ شباب میں ہوتا ہے غور کب ــــ اب بھی کریں نہ عیش تو بتلاؤ اور کب

فرمایا جوانی و پیری کا تقاضا ایک شعر میں دیکھو ؎

جوانی نے تو اپنے واسطے ہم کو اُٹھایا تھا ــــ بڑھاپا تو بٹھائے اب خدا کے واسطے ہم کو

میں نے داد دی کہ کیا پاکیزہ نشست و برخاست ہے لیکن طفلی جوانی اور پیری تینوں حالتوں پر میرے ریویو بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

وطن میں آج آکر چشمِ عبرت خوب روئی ہے ــــ یہ گلیاں وہ ہیں طفلی و جوانی جن میں کھوئی ہے

بشر کی غفلت و راحت پہ پیری آکے روتی ہے ــــ یہ دو مرقد ہیں طفلی و جوانی جن میں سوتی ہے

خیالِ کامرانی حیات دہر پر تف ہے ــــ جوانی جہل ہے طفلی خطا پیری تاسف ہے

فرمایا آج میں نواب احمد صاحب پروفیسر بڑودہ کالج کے اس شعر کا دیر تک مزہ لیتا رہا ؎

اترے ہیں جو زمیں پر روشن دماغ والے ــــ وہ تجھ کو ڈھونڈتے ہیں دل کا چراغ لے کر

۲۸ رجولائی ۱۹۲۰ء

یادِ الٰہی کے سلسلے میں فرمایا ہائے کیا لوگ گزر گئے کہ دنیا میں تھے مگر دنیا سے بالکل بے خبر۔ میرے ایک خوش لیاقت دوست تھے شعر و سخن کا بھی ذوق رکھتے تھے جب ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہوا تو حکام رس لوگوں نے انگریزی عہدہ داروں کے سامنے نوحے پڑھے قصائد پیش کیے، تعزیتی مظاہرے کیے ایک دفعہ مجھے میرے یہ دوست ملے۔ میں نے کہا آپ نے کلکٹر صاحب کے سامنے کوئی تعزیتی قصیدہ پیش نہیں کیا؟ پوچھا: کس بات پر؟ میں نے کہا ملکہ معظمہ کی وفات پر۔ اتنا سن کر تعجب سے چونک پڑے بولے: ارے کیا ملکہ وکٹوریہ

مرگئیں؟ میں نے کہا اللہ اللہ ہفتوں سے ملک میں ایک تہلکہ پڑگیا ہے اور آپ کو اس کا علم تک نہیں۔ دیکھیے ان خیالات کو میں نے اس شعر میں یوں زبان دی ہے ؎
جو صرفِ عشق ذہنی قوتیں ہیں تن سے ہیں غافل ؎ بھاگی ہیں جو پریاں اکثر اپنے گھر نہیں آتیں
میں نے تعریف کی کہ کیسی سامنے کی باتوں سے آپ نے کیسے دقیق معانی سمجھا دیے حقیقت یہ ہے کہ "کہنا اس کو کہتے ہیں"۔ میرے دادا مولوی عزیز الدین صاحب رئیس بدایوں جب پیلی بھیت میں منصف تھے تو ان کی محویت اور ذہنی قوتوں کی تن سے غفلت کا ایک واقعہ بریلی کے رئیس مولوی محمد خلیل صاحب بیان فرماتے تھے۔ کہتے تھے کہ آپ کے دادا سے میرے والد صاحب کے گہرے مراسم تھے۔ میں بریلی جاتے وقت چند گھنٹوں کے لیے پیلی بھیت میں ٹھہرا منصف صاحب کے یہاں پہنچا، دسترخوان پر بیٹھے تھے اسی وقت کھانا ختم کر چکے تھے مجھے دیکھ کر بولے ارے خلیل تو کب آیا آ کھانا کھالے میں بیٹھ گیا۔ دسترخوان پر صرف کھچڑی تھی۔ منہ میں نوالہ دیا حلق سے نہ اتر سکا۔ کھچڑی بالکل پھیکی تھی۔ مجھے تکلف کرتے دیکھا تو دریافت فرمایا کیوں کھاتا کیوں نہیں؟ کیا کھا کر آیا ہے۔ میں نے کہا کھچڑی بالکل بے نمک کی ہے۔ اتنا سن کر عظیم کو آواز دی وہ آیا۔ پوچھا: کیا آج کھچڑی میں نمک نہیں ڈالا؟ لڑکا کہتا ہے بالکل بے نمک کی ہے۔ عظیم نے کھچڑی چکھی اور کہا: ہاں حضور آج نمک ڈالنا بھول گیا۔ فرمایا: جاؤ اس بچے کو کچھ اچار وغیرہ لاکر دو جب ہی اس کے منہ میں نہیں چلتی حالانکہ خود وہی کھچڑی پیٹ بھر کر کھا چکے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ؎

جو صرفِ عشق ذہنی قوتیں ہیں تن سے ہیں غافل
بھاگی ہیں جو پریاں اکثر اپنے گھر نہیں آتیں

فرمایا دیکھو حضرت منصور کی Defence (برئیت) میں یہ شعر سنو ؎ غ

باطن کا جمال آئے بھی نظر اور رازِ دو عالم کھلتی ہو   آسان نہیں ہے اے اکبر عاشق بھی بننے کافر بھی ہو

۳۰ رجولائی سنہ ۱۹۲۰ء

ایک دن قبل مجھ کو اور چودھری رحم علی صاحب سب اڈیٹر انڈیپنڈنٹ کو اطلاع کرائی تھی کہ ہم لوگ ۳۰ رجولائی کی شام کو آئیں۔
"ذوقی شاہ صاحب آرہے ہیں اُن کی وجہ سے سماع کا انتظام کیا گیا ہے اور کھانا بھی ساتھ ہی کھائیں" میں حسبِ عادت مغرب سے قبل کھانا کھا کر پہنچا۔ چودھری رحم علی صاحب موجود تھے۔ معلوم ہوا ذوقی شاہ صاحب کی اطلاع آگئی وہ نہیں آرہے ہیں، اس لیے سماع نہیں ہوگا۔ میں نے چودھری رحم علی صاحب سے آہستہ سے پوچھا آپ کھانا کھا کر آئے ہیں؟ بولے نہیں میں نے کہا ؎

آنکھوں میں آگئی ہیں قیامت کی شوخیاں   دو چار دن رہا ہوں کسی کی نگاہ میں

میرا خیال ہے کہ دعوتِ سماع و طعام ذوقی شاہ صاحب کے سلسلے میں تھی جب گانا نہیں تو کھانا کیسا یہاں نری دعوتِ اشعار معلوم ہوتی ہے ع

بہر مرض کہ بنالد کسے شراب دہند

میں تو کھانا کھا کر آیا ہوں اور ابھی بیٹھوں گا آپ باتوں باتوں میں نشا لے لیجیے اور جلد اٹھ جائیے کہ گھر کا دروازہ بھی بند نہ ملے۔ یہی ہوا کہ انھوں نے اجازت چاہی تو فرمایا ابھی بیٹھیے کچھ اشعار سن کر جائیے۔ غرض چند اشعار سنائے جب یہ شعر سنایا ؎

اب اپنے دل کو بجز غم کے کوئی راہ نہیں   خدا کا شکر یہی ہے غم گناہ نہیں

تو میں نے کہا آپ کے شکر کے واسطے کیا پاکیزہ پہلو تلاش کیا ہے میں اس سے پہلے شکر و شکوے کے واسطے آپ کے اس انتخاب کا قائل تھا ؎

ہنگامہ شکر و شکوہ دنیا میں ہے گرم   لیکن مرے دل سے یہ صدا آتی ہے

کھلتا نہیں رازِ دہر شکوہ ہی تو یہ　　اور شکر یہ ہی کہ موت آ جاتی ہی
لیکن "غم گناہ نہیں" والا پہلو اس سے زیادہ قابلِ داد ہی۔

۱۱ اگست ۱۹۲۰ء

سیّد صاحب کی ایک پڑوسی سے ایک مکان کے بارے میں کچھ مقدمہ بازی ہو رہی تھی۔ اس سلسلے میں میرے مکان پر کٹرے میں تشریف لائے اور جناب والد صاحب سے فرمایا کہ بابو دوارکا پرشاد صاحب منصرم جج سے سفارش فرماکر مقدمے کا اجلاس تبدیل کرا دیں۔ ملازم سلیمان ساتھ تھا والد صاحب نے شربت پیش کیا سلیمان کو بھی دیا وہ ہچکچانے لگا اُس کے تامّل کو دیکھ کر سیّد صاحب نے فرمایا: سلیمان لے لو، وہیں تخت پر بیٹھ کر پی لو تخت اور سلیمان کے تسلسل نے ڈاکٹر شاہ سلیمان صاحب کا خیال دلایا۔ والد صاحب سے فرمانے لگے: ڈاکٹر شاہ سلیمان صاحب ایک قابل شخص ہیں بہت اچھا ہوا کہ ہائی کورٹ کے جج ہو گئے۔ تھوڑی دیر تامّل کرنے کے بعد فرمایا دیکھو کیا اچھا مصرع آیا ہی ع ۔ غ

جج ہائی کورٹ اب تختِ سلیماں ہو گیا

میرے تایا مولوی وہاب الدین صاحب نے دوسری باتوں میں لگا لیا۔ دوسرا مصرع نہ ہو سکا۔

۲۷ اگست ۱۹۲۰ء

فرمایا: لوگ کہتے ہیں کہ میں حکومت یا لالچ کے خوف سے خاموش ہو گیا ہوں اور ملک کو آزادی دلانے میں حسبِ توقع حصّہ نہیں لیتا۔ جب میرا یقین ہی کہ حکومت سے کھُل کر لڑنا مضر ہی تو بھلا میں کیا کہوں اور میرے کہنے سے ہو بھی کیا سکتا ہی۔ میں نے اسی خیال کو نظم کیا ہی ؎

دے خار کوئی گل تو میں بے شک اُلجھ پڑوں　　　بگڑی ہوئی ہوا ہو تو موسم سے کیا لڑوں

ہم اس زمانے میں رہتے ہیں اپنے گھر میں پڑے　　　ہوا ہی بدلی ہوئی ہو فلک سے کون لڑے

ہی چرخ ہم سے برسرکیں غور کیا کریں　　　بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے اور کیا کریں

میں سن کر خاموش بیٹھا رہا۔ اس پر فرمایا آپ نے توجہ نہیں کی۔ میں نے کہا ہاں،
یہ آخری شعر شاعرانہ نقطۂ نظر سے اچھا ہی مگر فلسفے کے لحاظ سے اس نے مجھے
متاثر نہیں کیا اہلِ تصوّف پر آج کل بڑا الزام یہی ہی کہ یہ لوگ اپنی تعلیم سے
قوم کے قوائے عمل کو مضمحل کر رہے ہیں۔ انھیں اپنی "گلیم کی فکر ہی" غریق کی
نہیں انھیں سر جھکائے بیٹھا رہنا اور ذلّتوں پر صبر کی ہدایتیں کرتے رہنا آتا ہی
اس کے برخلاف مجھے آپ کی یہ تعلیم پسند ہی ؎

میں نامِ سعی کا اپنی خدا نہ رکھوں گا　　　جو بن پڑے گی مگر وہ اٹھا نہ رکھوں گا

مسکرا کر فرمایا: اچھا اپنے مذاق کا ایک دوسرا شعر سنو میں نے راہِ سعی و عمل میں
بیٹھ جانے والوں کی مایوسی اور پست ہمتی دور کرنے کے لیے کہا ہی ؎

جو تھک کے بیٹھ جاتا ہوں زمیں کہتی ہی یہ مجھ سے
ترے رکنے سے کیا ہوتا ہی ہم چلتے ہی رہتے ہیں

اس شعر کی میں نے بہت تعریف کی اور عرض کیا کہ جنگِ احد میں ایک صحابی
ابن نضرؓ نے ایسا کر کے دکھایا۔ جب حضور سرورِ کائنات کے شہید ہو جانے
کی غلط خبر مشہور ہوئی تو حضرت عمر فاروقؓ مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ ابن نضرؓ نے اُن
سے بیٹھ جانے کی وجہ دریافت کی۔ فرمایا: جب آں حضرت ہی نہ رہے تو لڑیں
کس کے واسطے؟ ابن نضرؓ نے جواب میں فرمایا کہ اس خبر نے آپ کو پست ہمّت
کر کے بٹھا دیا۔ میں کہتا ہوں کہ جب آں حضرت ہی نہیں رہے تو ہم جییں کس

کے واسطے؟ یہ کہہ کر تلوار لے کر پھر دشمنوں میں گھس گئے۔ ستر زخم کھا کر جام شہادت پیا۔ تمام جسم قیمہ ہو گیا تھا، صورت پہچانی نہیں جاتی تھی کہ یہ لاش ہے کس کی۔ ایک انگلی کے نشان سے بہن نے پہچان کر بتایا کہ میرے بھائی ابن نضرؓ ہیں ؎

ہم نے جو منہ سے کہا تھا وہی کر کے اٹھے   جان دی آپ کے دروازے پہ مر کے اٹھے

یہ سن کر سید صاحب نے فرمایا: ماشاءاللہ آپ کی طبیعت میں بہت سوز ہے، آپ کس کے مرید ہیں؟ میں نے کہا: کسی کا نہیں۔ فرمایا: تو کسی سلسلے میں داخل ہو کر قلب میں جلا پیدا کر لیجیے ؎

اعتبار اُن کا کر اکبر جو ہیں پابند نماز   ہیں یہی لوگ کہ جو وقت پہ کام آتے ہیں

پچھلی مرتبہ میں نے دہلی جا کر خواجہ صاحب کی شب بیداری، ان کی عبادت اور اُن کے حسن سلوک کو خود دیکھا۔ مریدوں سے جو نذر وغیرہ کی آمدنی ہوتی ہے اس کا بڑا حصہ حاجتمندوں، مسافروں، رشتہ داروں اور دوستوں کی خدمت کرنے میں صرف کر دیتے ہیں۔ اکثر لوگ ان کی کثیر آمدنی کو دیکھ کر جلتے ہیں۔ یہ جلنے والے بیشتر پڑھے لکھے اور بالخصوص تعلیمات کے لوگ ہیں۔ میں نے اسی کو محسوس کر کے کہا ہے ؎ غ

جناب خود تو فقط فیس ہی سے پلتے ہیں   مرید نذر جو دیں پیر کو تو جلتے ہیں

خواجہ صاحب کو خدا جس افراط سے دیتا ہے وہ اسی سیر چشمی سے صرف کر دیتے ہیں۔ میں نومبر میں دہلی گیا تھا تو اپنے خیال کے موافق کافی اوڑھنے بچھانے کا سامان لے گیا تھا لیکن دہلی کی سردی کے لیے وہ کافی نہ ہوا تو خواجہ صاحب نے ایک لحاف نہ صرف مجھے بلکہ میرے ملازم سلیمان کے واسطے بھی تیار کرا دیا۔ الہ آباد میں خود خواجہ صاحب کے مرید سیکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ اگر میں ایک بزرگ کا دست گرفتہ نہ ہوتا تو اس پیری میں مریدی خواجہ صاحب کی کرتا ؎

فقیروں ہی کی سبھا سبھا ہے جو مستند ہے یہی جتھا ہے
ہمارے صوفی کا رنگ اچھا کہ وجد ہے اور پیہم کتھا ہے

اگر آپ خواجہ صاحب کے مرید ہو جائیں گے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ یہاں کی خلافت کا مستحق آپ ہی کو قرار دیں گے اور تمام مقامی مریدین کے سرگروہ آپ ہی ہوں گے۔ یوں تو ہندستان میں بہت سے صاحبانِ عرفان ہیں لیکن خواجہ صاحب میں میں نے کچھ اور ہی چیز محسوس کی ہے

وہ کم ہیں تڑپنے میں جنھیں ملتی ہے لذت   یوں آپ کی شمشیر کے بسمل تو بہت ہیں

یہ اشعار میں نے خواجہ صاحب ہی کے لیے کہے ہیں ؎

حسن نظامی کو میں نے دیکھا شریف خصلت فقیر طینت
عمل ہے اپنے ہی عنصروں میں اگرچہ دہلی کی ہے ذہانت
عنانِ اندیشہ ہائے مضطر ادھر ادھر کو کبھی مڑی بھی
وہ دست دل ہے کہ جس سے چھوٹی کبھی نہ حبلِ متینِ وحدت
خمیر میں ان کے ہے تصوّف معاشرت میں ہیں بے تکلف
فروع جو کچھ بھی پیش آئیں اصول میں ان کے ہے قناعت

حُسّاد خواجہ صاحب کے متعلق مشہور کرتے ہیں کہ وہ گورنمنٹ کے ایجنٹ ہیں۔ لیکن پچھلی مرتبہ انھوں نے سندھ کے ایک پیر کو گرفتار کرنے پر گورنمنٹ کو ایک چٹھی بھیجی تھی اس سے لوگوں کو ان کی طرف سے بدگمانی دور کرنی پڑی۔ میں نے پوچھا چٹھی میں کیا لکھا تھا؟ فرمایا وہ تو شایع ہو چکی ہے آپ کی نظروں سے نہیں گزری؟ خواجہ صاحب نے لکھا تھا۔ اب تک آپ پولٹیکل لیڈروں کے خلاف تھے لیکن اب آپ نے درویشوں پر بھی ہاتھ ڈالنا شروع کر دیا ہے تاریخ شاہد ہے کہ فقیروں سے الجھ کر بڑی بڑی سلطنتیں الٹ گئی ہیں۔ یہ اقدام آپ کی

سلطنت کے زوال کا پیش خیمہ ہے۔ غرض کہ بہت سخت لکھا ہے۔ بیعت کے متعلق آپ غور کر لیجیے۔ خواجہ صاحب یہاں آنے والے ہیں آپ اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیجیے۔ میں نے عرض کیا: میرا خیال ابھی تو کسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا نہیں ہے اور جب ہوگا تو خواہ کوئی بزرگ ہوں اس خیال سے ہرگز نہ ہوگا کہ میں خلیفہ اور سرگروہِ جماعت بنایا جاؤں۔

۷ر ستمبر ۱۹۲۰ء

فرمایا: بعض لوگ شکایت کرتے ہیں کہ میں بازدید کی ملاقات کو نہیں جاتا۔ میں نے اپنی کمزوری کو پیش کر کے ان سے یوں معذرت کی ہے ؎

خلق مجھ سے طالبِ پابندئ اخلاق ہے　　میری یہ حالت کہ مجھ پر چھینک بوں بھی شاق ہے

فرمایا مولانا محمد کافی صاحب فرماتے تھے کہ ایک مغرب زدہ بیرسٹر صاحب اُن سے الجھ پڑے اور کہنے لگے کہ معاف فرمائیے ہمارے آپ کے خیال کا کہیں میل نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے کہا ہمارا آپ کا مرکزِ اتصالِ خیال ایک مقام ہے وہاں میل ہو سکتا ہے۔ پوچھا کہاں؟ فرمایا قبرستان۔ مولانا صاحب کے اس جواب نے مجھ سے یہ شعر کہلوایا ؎

اسٹیشنِ فنا کی بھی کیا خوب ریل ہے　　اس راہ میں ہر ایک پسنجر کا میل ہے

۲۲ر دسمبر ۱۹۲۰ء

فرمایا دیکھو کسی ایرانی نے کیا خوب کہا ہے ؎

مباش ای رہ نوردِ عشق غافل از طپید نہا　　کہ در آخر بجائے می رسد از خود رمید نہا

میں نے اس شعر پر اپنا ایک شعر بہم پہنچا کر اُس کو آج کل کے سیاسی رنگ میں یوں رنگا ہے ؎ غ

جو پوچھا کیوں کمر اس منزلِ تاریک میں باندھی　　زبانِ حضرتِ شوکت سے بولے یا اتر گاندھی

مباش اے رہ نوردِ عشق غافل از طپیدنہا　　　کہ در آخر بجائے می رسد از خود رمیدنہا

فرمایا چونکہ یہ فارسی کا شعر تھا اور رہا تما جی سے کہلوانا تھا اس لیے زبانِ حضرتِ شوکت کا اہتمام کیا گیا۔ فرمایا ملک کی فلاح اور رستگاری کے لیے کون کوشاں نہیں ہے لیکن آج کل سب سے زیادہ ساعی جو ہستی ہے وہ گاندھی جی کی ہے۔ گاندھی جی چونکہ بنیا ہیں (لالہ) اس لیے میں نے اس مفہوم کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

یوں تو ہیں جتنے شگوفے سب کو فکرِ باغ ہے　　　یہ مگر سچ ہے کہ لالہ ہی کے دل میں داغ ہے

میں نے عرض کیا کہ ایک لفظ لالہ سے آپ نے شعر کے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ یہ شعر آپ کے کمالِ فن کی کھلی ہوئی شہادت ہے۔ فرمایا گاندھی جی سے متعلق چیستاں کے طور پر ایک خیال آیا ہے دوسرا مصرع ابھی نہیں ہوا ہے۔ غ

گاندھی میں دھن بھی گائے بھی گھی بھی دہی بھی ہے

گویا لفظ گاندھی میں جو حروف ہیں ان کو اگر مختلف صورتوں سے رکھیں تو "دھن" یعنی دولت، گائے، گھی، دہی بن جاتے ہیں۔

فرمایا: ذو معنی لطف دیکھیے ظاہری و معنوی خوبیاں کیسی یک جا ہوئی ہیں ؎

پھنستی ہے اگر تو صرف مچھلی　　　کہنے کو تو جل بھی جال میں ہے

میں نے عرض کیا کہ یوں تو ہر شعر آپ کی ذہنی اولاد ہے اس میں آپ جس کو چاہیں زیادہ عزیز رکھیں لیکن مجھ سے پوچھتے ہیں تو اس شعر کا ذو معنی لطف اور اخلاقی اثر اسی غزل کے مطلع کی ذو معنی اور عرفانی رفعت کو نہیں پہنچتا ؎

کیا بات ترے جمال میں ہے　　　ہر وقت زمانہ حال میں ہے

۴؍ اکتوبر ۱۹۲۰ء

فرمایا جوانی اور تندرستی ختم ہونے پر تو بڑے سے بڑے ملحد کو بھی خدا یاد آجاتا ہے عالمِ شباب میں جتنی جلد طاعتِ رب کی طرف توجہ ہو انسان

اس کو اپنی خوش نصیبی اور منفعت سمجھے۔ ایک انگریز مجھ سے کہتا تھا کہ سید صاحب جوانی میں عبادت انسان کو بے کار اور بے گار نظر آتی ہے لیکن اس کا فائدہ وہ اس وقت دیکھتا ہے جب Death bed (بستر مرگ) پر ہو اس وقت بہت سہارا محسوس کرتا ہے۔ میں نے سید صاحب سے عرض کیا کہ مسلمانوں کی بربادی کا سبب ترکِ مذہب بتایا جاتا ہے اگر یہ سچ ہے تو اہلِ یورپ کو ہم سے زیادہ نکبت زدہ ہونا چاہیے اس لیے کہ وہ ہم سے زیادہ تارکِ مذہب ہیں۔ فرمایا آنحضرت صلعم کی تعلیم کے دو تاکیدی پہلو تھے (۱) خدا کو ایک مانو (۲) کسی غیر خدا کو معبود مت گردانو۔ اہلِ یورپ تعلیم نمبر ۲ پر پورے طور پر عامل ہیں اور نمبر ۱ کے تارک۔ یعنی اگر اہلِ یورپ خدا کو خدا نہیں سمجھتے تو کسی دوسری طاقت کے سامنے بھی گردنِ بندگی نہیں جھکاتے۔ مسلمانوں نے اس تعلیم کے دونوں اجزا کو چھوڑ دیا ایک تو خدا کو خدائے واحد نہیں سمجھتے دوسرے غیر خدا کو اس عقیدت سے پوجتے ہیں جو صرف خدا کے لیے زیبا تھی۔ مسلمان خدا سے زیادہ کلکٹر سے ڈرتے ہیں اور خدا کے سامنے درخواست الحمد پیش کرنے کے بجائے بڑے تعزیے پر عرضی باندھتے ہیں۔ میں نے اسی پر کہا ہے ؎ غ

خدا کا اب صرف نام ہی ہے گزشتہ پیروں کے سر ہے سہرا
انھی کی اب ہر طرف ہے پوجا وہ حی و قیوم بن رہے ہیں

اہلِ یورپ ہم سے اچھے ہیں کہ اگر ان کے نزدیک خدا محض ایک لفظ ہے تو تصرفاتِ اولیا بھی ایک کہانی ہے ؎

عمل جب اپنے نہیں ہیں اچھے تو ذکرِ عصیانِ غیر کیسا
عدو کی قسمت بگڑ بھی جائے ہماری قسمت وہی رہے گی

۱۴؍ نومبر ۱۹۴۲ء

فرمایا مسلمان مقاماتِ مقدسہ کے واسطے جاکر لندن میں عاجزی کر رہے ہیں
میں نے اس پر کہا ہے ؎

انقلاب دہر پر عقل آج کل حیران ہے　　آستانِ بت سرِ مومن خدا کی شان ہے

آج کل لوگوں نے جیل خانے جانا حق کے لیے نہیں فیشن اور نمود کے لیے اختیار
کر لیا ہے۔ اس پر کہا ہے ؎ غ

مل نہ سکتی میری تو جیل ہی کو جھیلتے　　ناتواں ہیں ورنہ کوئی کھیل ہم بھی کھیلتے

یہی خیال کہ آج کل حاکم و محکوم کا مشغلہ کیا ہے اس طرح پھر ادا کیا ہے ؎ غ

حکام ہیں خزانہ و توپ و رفل کے ساتھ　　خدام ہیں شگوفۂ ترکِ عمل کے ساتھ
بازو میں یاں نہ زور گلے میں نہ شوق شور　　ہم تو مشاعرے میں ہیں اپنی غزل کے ساتھ

کیا بتاؤں سٹن صاحب کے زمانے کی پریشانیوں کا ڈرا ہوا ہوں ورنہ جو کچھ
کہتا خوب جی کھول کر کہتا مگر خیر ؎

میرے سکوت سے مجھے بے حس نہ جانیے　　لفظوں ہی کی کمی ہے خیالات کی نہیں

ہندو مسلم اتحاد پر فرمایا کہ تمدن معاشرت زبان سب ایک کر لیں مگر میری سمجھ میں
نہیں آتا کہ عقائد میں یکسانیت کیونکر ہوگی؟ جو گائے ان کے لیے معبود دو ماتا
وہ ہمارے لیے لذیذ غذا۔ جب معاملہ آکر الجھتا ہے تو یہیں الجھتا ہے۔ اس خیال کو
نظم میں دیکھو ؎ غ

ہے ایک مراسلت ہندو مسلم کی　　ہر ایک نئے سنر پہ ملک کی شکی ہے
یکساں کرتے ہیں فیل جز بحث بقر　　ہاتھی تو نکل گئے ہیں دم اٹکی ہے

Feel

دیکھیے یہ اونٹ کس کل بیٹھتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ غضب کرتے ہیں
فیل بقر۔ ہاتھی کا پر انظم میں جمایا تو اونٹ کو نثر میں بٹھایا ہے میری اس تنقید
پر خوش ہوئے۔

۲۳ر نومبر ۱۹۲۰ء

فرمایا عشرت منزل کی ایک زمانے سے مرمت نہیں ہوئی ہے اب مجھ سے کچھ ہو نہیں سکتا عشرت کو اس طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ہے

سامانِ عیش کچھ نہ رہا اڑ رہی ہے خاک | اس غم میں اپنی جان مگر کیوں کروں ہلاک
میں نے تو جل کے کہہ دیا اس سال جون میں | ٹٹی اگر نہیں نہ ہو جس کم جہان پاک

گھر کی حالت آئے دن بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے اور چوروں کے لیے راستے کھلتے جا رہے ہیں انھی احساس کے تحت میں نے کہا ہے

جو ہے آرام دِہ بستر تو دروازہ شکستہ ہے | مصیبت دیکھیے نیند آرہی ہے سو نہیں سکتا

تھی خنیب تار یک جو آئے جو کچھ اٹھا لے گئے | کرہی کیا سکتا تھا بندہ کھانس لینے کے سوا

دیکھیے رہتا ہے کب تک ملتوی یہ قصدِ حج | گھر کی جانب سے تو اطمینان ہونے کا نہیں

فرمایا: دیکھو ملک و ملت پر فدا ہونے کی تعلیم یوں دیتا ہوں

جی کے مرنے میں کیا ہے ناز کی بات | مر کے جینا ہے امتیاز کی بات
چاہتی تھی زباں کرے تو غضب | دل پکارا کہ ہے یہ راز کی بات

میں نے عرض کیا کہ مولانا محمد علی صاحب نے اس راز کو فاش کر دیا ہے

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی | ہوسِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی

۳۰ر نومبر ۱۹۲۰ء

فرمایا سید . . . . علی صاحب وکیل شیعہ ہیں مگر جب سُنّیوں میں بیٹھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ میں شیعہ گھرانے میں پیدا ہوا ہوں مگر شیعہ نہیں ہوں، ماتم تبرّے، تعزیے وغیرہ کو بے کار سمجھتا ہوں اُن کے اس اعلان سے میں نے سوچا کہ یہ شیعہ ہونے سے تو خود منکر ہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ سنّی بھی

نہیں ہیں۔ ہوں نہ ہوں مونث و مذکر کے درمیان کی جنسِ خنثیٰ ہیں دیکھیے میں نے
اُن کی اس دورُخی بات پر کیسا نوٹ کیا ہے ۔ غ

She He

مذکر کے لیے ہی ہے مونث کے لیے شی ہے مگر حضرت مخنث ہیں نہ ہیوں میں نہ شیوں میں

میں نے عرض کیا کہ مقبول حسین صاحب ظریف لکھنوی کا مصرع ہے۔ ع

معشوق وہی ہے کہ جو مادہ بھی ہو نر بھی

فرمایا: بعض اہلِ تشیع کے تعصب کا یہ عالم ہے کہ کسی شخص کے کمالِ فن کا اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ صاحب کمال سُنی ہے تو وہی کمال اُن کی نظر میں عیب معلوم ہونے لگتا ہے۔ میرے بعض عزیز مجھ سے محض اس لیے جلتے ہیں کہ میں سُنّی ہوں میں نے اُن کے دل کے چور کو یوں پکڑا ہے ۔ غ

بولیں بیگم کرتی ہیں اکبر سے عقد سنتی ہوں لیکن کہ سُنّی ہے مُوا
کہہ دیا میں نے رہو تم منتظر تُرک ہارے اور میں شیعہ ہوا

اس پر ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کی آبرو ترکی حکومت کے وقار سے بہت کچھ قائم ہے اور اس کے مٹتے ہی مسلمان آوارہ منتشر ہو جائیں گے لیکن ترکوں کے ہارنے سے شیعہ ہو جانے کا کوئی جوڑ نہیں مفتوح فاتح کا مذہب قبول کرتا ہے ترک شیعوں سے نہیں لڑ رہے ہیں عیسائیوں سے برسر پیکار ہیں۔ اس پر میں نے معترض صاحب کو جواب دیا کہ آخری مصرع کو یوں کر دو ۔ غ

تُرک ہارے اور میں عیسائی ہوا

اس میں اور بلاغت پیدا ہو گئی کہ بیگم کو عیسائیوں سے اتنا بیر نہیں جتنا سُنّیوں سے ہے اس لیے عیسائی ہو جانے کے بعد مجھے قبول کر لیں گی۔ فرمایا لوگ آج دین کو زیادہ تر سوسائٹی کی خاطر بدلتے ہیں ۔

کبھی اسلام لاتے تھے کہ ہو دینِ خدا قائم اور اب مذہب بدلتے ہیں کہ ہو اپنا جتھا قائم

فرمایا "شیعہ ہوا" کو "عیسائی ہوا" سے بدلنے پر خیال آیا میں نے کلکتہ والی مس گوہر کے لیے کہا تھا ؎

کون آرام سے دنیا میں ہے گوہر کے سوا　　سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

اس پر ایک صاحب نے کہا کہ آپ کو واقعات کا علم نہیں اور آپ نے شعر لکھ دیا گوہر اب بے شوہر کی مس نہیں ہے اس نے ایک ایرانی سے عقد کر لیا ہے میں نے اُن سے کہا: تو بقول حضرت شیخ سعدی یہ تو بڑے رشک کی بات ہے ؎

ہرگز حسد نہ بردم بر منصبے و مالے　　لیکن برآں کہ دارد از دلبرے وصالے

جب عقد ہو چکا ہے تو دولہا کے گھوڑے کے ساتھ میرا شبدیز خیال یوں چلے گا ؎

مردِ خلیج فارس گیسو ہیں جس کے کالے　　گوہر نے آب اپنی کر دی اسے حوالے

اکبر کے اب یہ مصرعے جس ذہن میں چاہے گا لے　　ہرگز حسد نہ بردم بر منصبے و مالے

لیکن برآں کہ دارد از دلبرے وصالے

فرمایا مجھے تصوّف اپنے والد صاحب سے ملا اور اب میں دیکھ رہا ہوں کہ میری طرح عشرت حسین کی طبیعت میں بھی تصوّف سے لگاؤ پیدا ہوتا جا رہا ہے میرے ان دو اشعار کو بہت سراہ رہے تھے اور لطف اٹھا رہے تھے ؎

دنیا کے تغیّر کا نہیں جس شیدائے جمالِ باری کو　　پروانے کو مطلب شمع سے ہے کیا کام ہے رنگِ محفل سے

وہاں قالو بلیٰ یہاں بت پرستی　　بھلا سوچو کہا کیا تھا کیا کیا

میں نے عرض کیا کہ اس دوسرے شعر کے مضمون کو میں نے یوں ادا کیا ہے ؎

کل ہم نے عہدِ عشق کیا توڑتے ہیں آج　　پیمانۂ شراب سے پیمانِ زندگی

فرمایا: مسلمان اب تک اس خوابِ خرگوش میں تھے کہ اہلِ ہنود کے مقابلے میں ہم میں عسکریت کے جوہر زیادہ ہیں لیکن کٹار پور میں اہلِ ہنود نے گائے ذبح کرنے

پر مسلمانوں کو ذبح کر کے رکھ دیا میں نے اسی سے متاثر ہو کر کہا ہے ؎ غ

خدا ہی ہے جو ان کے سینگ سے بچ جائیں بقر عیدی
سُنا ہے آ چلی ہیں اب گئو ماتا بھی مستی پر

۶ ستمبر سنہ ۱۹۲۰ء

دورانِ سر کی کئی دن سے شکایت تھی میں نے آج جا کر مزاج پوچھا فرمایا ؎

اب ہے بیماری ہی اکبر اپنا شغلِ زندگی — جب فقط مرنا ہی باقی ہے تو اچھا کیوں رہوں

دنیا سے میں کیا لگاؤں دل اب — آنکھیں چھت سے لگی ہوئی ہیں

میں نے عرض کیا چھت کے تسلسلِ خیال نے یاد دلایا آرزو لکھنوی کا شعر ہے ؎

تھی شام سے صبح تک سوئے در — اب چھت سے نگاہ جا لگی ہے

فرمایا اس تنہائی اور اس معذوری میں سریع الاحساسی میرے لیے اور عذاب جان ہو گئی ہے ؎

خودی کے حس سے بھی ہوتا ہے انتشار اکبر — کہاں رہوں کہ مجھے بھی مرا پتا نہ چلے

فرمایا میں نے ریاض خیر آبادی کو جب اس زمین کا یہ شعر سنایا ؎

امیدِ حور میں مسلم تو ہو گیا ہوں مگر — خدا ہی ہے کہ جو مجھ سے یہ پنچگانہ چلے

تو ریاض کہنے لگے کہ حقیقت یہ ہے کہ "یہ پنچگانہ چلے" جیسی باتیں ہم سے بن نہیں پڑتیں اس کے بعد سیّد صاحب نے فرمایا اہلِ عرفان کا مطمحِ نظر سیاسی و مادّی مفاد سے بہت بلند ہوتا ہے وہ اپنے نفس کے تزکیے میں لگے رہتے ہیں اور بندگانِ خدا کو اپنی دعا سے فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ان کو محویت سے فرصت ہی نہیں ہوتی جو سیاسی کھیل کھیلیں۔ میں نے عرض کیا میرا ایک شعر ہے ؎

اے منکرِ کشف و کراماتِ دل تو منزلِ صادق ابھی آئی تو نہیں بطلانِ حقیقت پھر کرنا پہلے اک جام چڑھا تو سہی

فرمایا: دیکھو اس قسم کے معترض کو میں نے یہ جواب دیا ہے ؎ غ

نیتِ عشق اگر میں نے نہ باندھی ہوتی عقل میری بھی یہاں حامیِ گاندھی ہوتی

شکر ہے مجھ میں سمائی نہیں یورپ کی ہوا ورنہ وہ شمعِ بصیرت پہ اک آندھی ہوتی

کانگرس کے دوش بدوش کھڑے نہ ہونے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے ؎

مدخولۂ گورمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

۸ر دسمبر ۱۹۲۰ء

فرمایا ہم کو مشیّت کی بہت سی باتیں بہ ظاہر جبر و ظلم نظر آتی ہیں۔ مگر بندہ ہونے کی حیثیت سے ہم کو ایسا کہنے کا حق نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا کہ مولوی نولاحسین صاحب کا ایک شعر سنیے ؎

وہ مختارِ عمل مجھ کو کریں تو اختیار ان کا مری مجبوریاں تو یوں بھی ثابت ہیں کہ بندہ ہوں

حضرت حافظ شیرازی نے اس مسئلے کا آخری تصفیہ یہی کیا ہے ؎

گنہ اگرچہ نبود اختیارِ ما حافظ تو در طریقِ ادب کوش و گو گناہِ من است

فرمایا میں نے محمود اور کاسۂ چینی کے واقعے کے ساتھ یہی شعر کل ایک صاحب کو سنا کر اپنا یہ شعر پڑھا تھا ؎

اگرچہ تلخ دیا جامِ عمرِ فانی کا مجھے محل نہیں ساقی سے بدگمانی کا

میں نے شعر کی تعریف کی کہ واقعی اوّل تو ہم کو عمر ہی کون سی ایسی طویل عطا کی ہوئی ہے اس میں بھی راحت مفقود، پھر ماموں نولاحسین صاحب کا شعر سنیے ؎

بیاضِ ہستیِ فانی سے گم ہے صفحۂ راحت رسالہ مختصر سا لائے ہیں وہ بھی ورق نکلا

فرمایا ماشاء اللہ آپ تو شعر کی گورمنٹ ہیں۔ اچھا اس مضمون پر اپنا ایک شعر اور سناتا ہوں اگر قانون کی طرح آپ کے یہاں پاس ہو جائے تو سمجھوں گا کہ واقعی اچھا ہے ؎

غم میں بھی قانونِ قدرت سے میں کچھ بدظن نہیں
جانتا ہوں یہ کہ میرا دوست ہے دشمن نہیں

میں نے بہت داد دی اور عرض کیا کہ ایک ایرانی نے نعت کے اس شعر میں خدا کو رقیب گردانتے ہوئے دامن ادب کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے ؎

دل از عشقِ محمد ریش دارم　　رقابت با خدائے خویش دارم

کہتا ہے خدا بھی کسی غیر کا نہیں ہے میرا ہی ہے، اس طرح آپ کا بھی ایمان ہے کہ دوست ہے دشمن نہیں۔ واہ واہ اس شعر کی کافی داد نہیں دی جا سکتی ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار　　گلچین نگاہ تو زداماں گلہ دارد

۲۵ دسمبر ۱۹۲۰ء

میر آغا صاحب افغانی نے اپنے ایک خط میں لاہور سے مجھے ایک شعر لکھا تھا

چو خوں بہا طلبند از تو کشتگاں در حشر　　تبسمے کن و بگزر کہ ایں ادا کافیست

میں نے یہ شعر سید صاحب کو سنایا فرمایا کوئی خاص بات نہیں ہے شعر Artificial (مصنوعی) ہے۔ عاشق کو با مروّت ہونا چاہیے شکایت کیسی۔ میں نے کہا شکایت بھی فطرت ہے مگر خیر آپ کو یہ رُخ پسند نہیں ہے کسی اور کا شعر ہے ؎

مروّت کب تمھارا نام لینے دے گی محشر میں　　مگر اتنا تو کہہ دوں گا اسی مجمع میں قاتل ہے

فرمایا: اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ طالب اپنے مطلوب کو سزا دلانا چاہتا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ طالب خود نہیں کہے گا جب اس سے دریافت کیا جائے تو اسے کہنا پڑے گا۔ فرمایا مضمونِ شعر سے یہ ظاہر نہیں ہوتا۔ میں نے عرض کیا مولوی تولا حسین نے اسے ظاہر کر دیا ہے ؎

تمھارے ظلم محشر پوچھتا ہے کیا کہوں چپ ہوں　　کہوں ہاں تم اگر کہہ دو کہہ دو میرے کہنے سے

حضرت امیر خسرو نے تو وہاں کا تمام مقدمہ یہیں ترتیب دے لیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بمحشر گر ترا پرسند خسرو را چرا کشتی　　　　حسرت گردم چہ خواہی گفت گفتا من ہماں گویم

فرمایا: ماشاء اللہ آپ کو بے شمار اچھے اشعار ہر وقت یاد آجاتے ہیں آپ مضمون وار اشعار یک جا کر کے ایک کتاب کی شکل میں کیوں نہیں پیش کر دیتے خیر اس مضمون سے متعلق میرا تو ایمان یہ ہے کہ حشر جس کا نام ہے وہ عالم ہی دوسرا ہوگا حضرت امام حسین علیہ السلام یا سرمدؒ جیسے آزاد دیدہ خاصانِ خدا اپنا اپنا عرضی دعوے ہاتھ میں لیے ہوئے حشر میں ہرگز نہیں دکھائی دیں گے۔ دیکھو میں نے اس خیال کو اور خیال کیا حقیقت کو اس طرح پیش کیا ہے ؎

خاصانِ حق کو حشر میں کیسی شکایتیں　　　　عالم بدل گیا ہے وہ دنیا نہیں رہی
ایسے ہوئے ہیں محوِ تماشائے روئے دوست　　　　دشمن سے انتقام کی پروا نہیں رہی

میں نے تعریف کی۔ فرمایا: دیکھو میں نے حکومت کی خوش اقبالی اور اہلِ ہند کی تباہ حالی کا یوں فوٹو کھینچا ہے ؎

ہر گولا فینکس میں مصروف صبح و شام ہے　　　　اس طرح برباد کرنا آپ ہی کا کام ہے

معاذ اللہ کیا مجبوریِ تقدیرِ بسمل ہے　　　　تڑپنا سامنے قاتل کے گستاخی میں داخل ہے

وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں　　　　وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے

مٹاتے ہیں وہ ہم کو تو اپنا نام کام کرتے ہیں　　　　مجھے حیرت تو اُن پر ہے جو اس مٹنے پہ مرتے ہیں

۲۱ر جنوری ۱۹۲۱ء

فرمایا عشرت بڑے شیعہ گر ماحول میں رہتے ہیں مجھے بسا اوقات ان اثرات کو توڑنے کی فکر لگی رہتی ہے میں نے کہا وہ اب بچے نہیں ہیں، بچوں والے ہیں۔ آپ "دامن تر مکن ہشیار باش" کب تک کہتے رہیں گے۔ فرمایا" جو

بن پڑے گی مگر وہ اٹھا نہ رکھوں گا" اس دن میں نے ڈاکٹر شاہ سلیمان صاحب سے بھی کہا کہ عشرت کو اہلِ تشیع کے اثرات سے بچائے رہیے مگر انھوں نے وکیلانہ جواب دیا کہ آپ یہی کلمات عشرت حسین کے روبرو مجھ سے فرمائیں تو میں توجہ کے ساتھ تعمیل کروں گا۔ مختلف صاحبانِ عرفان مثلاً غفور شاہ صاحب، ذوقی شاہ صاحب، شاہ دل گیر صاحب، خواجہ حسن نظامی صاحب کو عشرت منزل میں جمع کرنے کا میں نے سلسلہ اسی لیے ڈالا ہے اور قوالی کے جلسے کرتا رہتا ہوں کہ عشرت اس رنگ کو طبیعت میں پختہ کرلیں۔ یہ میں خوب جانتا ہوں کہ گرد و نواح کی قوت کچھ کم نہیں ہے۔ شعر سُنو ؎

تازگی رنگِ گلِ پژمردہ میں ممکن نہیں   کیا چلے بادِ صبا کی لُطفِ شبنم کیا کرے

مگر میں عشرت کو گلِ پژمردہ نہیں سمجھتا بہر حال مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے کرتا ہوں نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ دیکھو اس غزل میں "ہم" کے قافیے کو ردیف کے ساتھ کس ترتیب سے بٹھایا ہے ؎

نیٹوویت پر کیا میں نے جو اظہارِ ملال   سُن کے صاحب نے کہا سچ ہے مگر ہم کیا کرے

میں نے عرض کیا: یہ اس قسم کی ترکیب ہے ؎

قصۂ منصور سن کر بول اٹھی وہ شوخ مس   کیسا احمق لوگ تھا پاگل کو پھانسی دے دیا

فرمایا ماشاء اللہ خوب یاد رکھا۔

۲۳ جنوری ۱۹۲۱ء

آج شام کو قوالی کا جلسہ تھا میں جلسے سے پہلے حاضر ہوا۔ فرمایا قافیوں کی بے تکلفی دیکھیے ؎ غ

دھڑکوں سے طبیعت بے کل ہے دل سینے میں سہما جاتا ہے
تسکین و تسلیں دیتی ہیں گھبرانے کو دہم آجاتا ہے

میں نے عرض کیا آپ توانی کو فرماتے ہیں۔ میں مطلب کا لطف اٹھا رہا ہوں کیا پاکیزہ Psyco analysis ہے۔ ان قلبی وارداتوں کو الفاظ سے ادا کر دینا معمولی بات نہیں ہے۔ بقول آپ کے "دل پہ گزری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں"۔ فرمایا: دیکھو اس مضمون کو کہ اہلِ یورپ کی ثروت کا سبب ہم اور ہمارا ملک ہے ایک چیستاں کی شکل میں یوں ادا کیا ہے ۔ غ

یہ فربہی ہے ہمارے تمھارے اجزا سے   عیاں ہے صورتِ یورپ تصوف پوری ہیں

ایک اور چیستاں دیکھیے ۔

بکارِ دین ہم آمادہ دلِ پرجوشِ من باشند   مسلماں می شوم سلما چو در آغوشِ من باشند

"سلما" کو "من" کے آغوش میں رکھیے تو "مسلمان" ہو جاتا ہے۔ فرمایا حکومت آگ کو آگ سے بجھانا چاہتی ہے۔ اس غلط عمل پر اسے متنبہ کرتا ہوں ۔

مفر فریادیوں سے اپنے تم ہرگز نہ پاؤ گے   اثر میں تیز ہو گی آہ کو جتنا دباؤ گے

فرمایا ایک مشہور اخبار کے اڈیٹر کو حکومت نے چاشنی دے کر اڈیٹری کا کام چھڑا دیا اور عہدہ دار بنا دیا۔ اس پر حکومت کو مبارک باد دیتا ہوں ۔ غ

لیڈر پہ اب تو تنگ ہے وسعت برس کی بھی   خوش ہو جیے کہ آپ کے فقرے میں آگیا

ہائے ۔غ

دل اپنا دوست ہو کر جب دکھاتا ہے غلط راہیں   پھر اُن کی آنکھ کو میں کیا کہوں وہ تو عدو ہی ہے

۲۸ جنوری ۱۹۲۱ء

مولوی نور الحسن صاحب رجسٹرار سے فرمانے لگے اب میں چراغِ سحری ہوں عشرت کی فکر دامنِ دل کو اب بھی پکڑے ہوئے ہے ان کو کس کے سپرد کروں۔ دنیوی جاہ کا خیال آتا ہے تو کہتا ہوں لاٹ صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دے جاؤں، دینی فوائد پر نظر جاتی ہے تو کہتا ہوں کہ آپ جیسے صاحبانِ عرفان

کے سپرد کر جاؤں۔

۱۴ر فروری ۱۹۲۱ء

فرمایا سیاسی جدوجہد میں حصّہ نہ لینے کی معذرت سُنیے ؎ غ

ہم سے تو امید اب ہے بے سُود اب آپ ہی کیجیے اُچھل کُود
تیزاب میں ہم تو گل چکے ہیں غ ان کے سانچے میں ڈھل چکے ہیں
لوگوں نے قومی خدمت کو تماشا بنا لیا ہے ؎ غ

ل نہ سکتی میری تو جیل ہی کو جھیلتے ناتواں ہے ورنہ کوئی کھیل ہم بھی کھیلتے

میں نے عرض کیا اس سے قبل بھی میں نے یہ شعر سُنا تھا آپ نے اس میں خدّامِ قوم کا مضحکہ اڑایا ہے۔ اس کے برخلاف آپ نے خود ہی تعلیم دی ہے ؎

بہتر سمجھے ہو تم جو خاموشی کو یہ بھی نہ کہو کہ خامشی بہتر ہے

اگر آپ کے لیے خاموشی بہتر ہے چپ رہیے لیکن دوسروں کو کہنے اور کرنے سے کیوں روکتے ہیں۔ اس پر میں نے دیکھا سیّد صاحب کچھ نادم سے ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد فرمایا: ہاں یہ سچ ہے کہ میں نے مضحکہ اڑایا ہے مگر صرف اُن کا جو خواہشِ نمُود کے تحت پبلک پلیٹ فارم پر آتے ہیں لوگوں کا خیال ہے کہ میں اپنی پنشن کے خیال سے قومی کام میں سامنے نہیں آیا۔ یہ غلط ہے اگر آج میں رُپے کی خاطر قوم کا کام کروں اور پوری قوّت اس طرف صرف کر دوں تو کیا مجھ کو پنشن سے زیادہ فائدہ نہ ہو۔ اصل یہ ہے کہ مجھے کانپور کے واقعے؎ کے بعد کی کش مکش یاد ہے۔ میں دو باتوں سے گھبراتا ہوں۔

؎ کان پور کی مسجد کا مشہور واقعہ ہے کہ اس کے کچھ حصّے کے شہید کیے جانے کے سلسلے میں بڑا ہنگامہ ہوا تھا بہت مسلمان گولیوں سے مارے گئے تھے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب عین ہنگامہ کے دن الہ آباد سے ہوتے ہوئے کان پور پہنچے حکومت (باقی)

ایک تو عشرت کے مصیبت میں پڑنے سے دوسرے اس خیال سے کہ میں اس
پیرانہ سالی میں اپنے جسم میں اتنی سکت نہیں پاتا کہ جیل کے مصائب اٹھا سکوں
کاش آج میری جوانی کا زمانہ ہوتا اور مجھ میں جان ہوتی۔

فرمایا: دیکھو جوانی سے حسن و عشق کا ایک مضمون یاد آیا ؎

ادھر پیغام حسرت کا اُدھر تمکین تقوے کی   زلیخا کی نظر ہے اور یوسفؑ کی جوانی کی

میں نے عرض کیا کہ زلیخا کی نظر سے مجھے زلیخا کی دست درازی یاد آئی ایک
ایرانی اس حرکت پر عشق کو معذور سمجھتا ہے اور حضرت یوسفؑ کو خطا وار ٹھیراتا
ہے کہ زلیخا کا مقصد دامن پھاڑنا ہرگز نہ تھا اس نے تو صرف دامن پکڑا تھا
حضرت یوسفؑ نے جھٹکا کیوں دیا جو پھٹ گیا اور اس کا اتنا بڑا مقدمہ
بنا کہتا ہے ؎

در بید دامنِ یوسفؑ کشیدنِ داماں   گنہ ز جانبِ سر پنجۂ زلیخا نیست

فرمایا: میں اس وقت اگر عملی طور پر شریک نہیں ہوں تو دعا سے ہوں ؎

انجن ہے دل اور آہ ہوائی جہاز ہے   ہم نے سمجھ لیا ہے خدا کارساز ہے

فرمایا اہلِ یورپ نے اخلاق کے تمام قدیم اصول الٹ کر رکھ دیئے مثلاً تقویٰ

(نوٹ صفحہ ۱۶۳) کو شبہہ ہوا کہ مسجد کے واسطے آمادۂ فساد لوگوں میں اکبر بھی شریک ہیں اس
شبہہ میں اکبر کے اس شعر نے اور تقویت دی ؎ غ

سنا یورپ میں ہر قاصد پیامِ جنگ لایا ہے   بحمد اللہ اب خونِ شہیداں رنگ لایا ہے

سمجھا یہ گیا کہ "خونِ شہیداں" سے کانپور کے شہیدوں کی طرف اشارہ ہے اور اس پر شکر خدا
اور اظہارِ مسرت کیا جا رہا ہے کہ حکومت برطانیہ یورپ میں جنگ کی پریشانیوں میں مبتلا
ہوگئی سر جیمس مسٹن صاحب گورنر تھے انھوں نے اکبر کو سخت پکڑا آخیر خدا خدا کرکے عافیت
اور پنشن دونوں مصیبتوں سے بچیں۔ یہاں اس واقعہ اور کش مکش کی طرف اشارہ ہے۔

حیا، صدقِ مقال سب کو ترک کر بیٹھے ہیں اگر ڈارون کی یہ تھیوری درست ہے کہ انسان بندر سے پیدا ہوا ہے تو اس منزلِ تمدن پر اہلِ یورپ کو انسانیت کے بہت سے اعلیٰ محاسن کا حامل ہونا چاہیے تھا۔ مگر نہیں۔ اس پر افسوس کرتا ہوں ؎ غ

یا الٰہی یہ کیسے بندر ہیں ارتقا پر بھی آدمی نہ ہوئے

میں نے عرض کیا آپ نتیجہ کو دیکھ کر افسوس کرتے ہیں یا ڈارون صاحب کی تھیوری پر ایک کاری ضرب لگاتے ہیں شعر کیا ہے چشم احول ہے ع

کجا می نماید کجا می زند

فرمایا ہمارے لیڈر حکومت سے بیزاری اور قوم سے ہمدردی کا اعلان کرتے ہیں لیکن ان کے دل کو ٹٹولتا ہوں تو وہی یورپ زدہ پاتا ہوں کام میں خلوصِ نیت اور پاسِ مذہب بہت کم ہے ؎ غ

غصے میں غریبوں کی یہ چیں چیں بھی چلی جائے
صاحب کی مشینوں کی وہ پیں پیں بھی چلی جائے
لیکن جو قضا پیشِ نظر ہو تو خدا را
کچھ خدمتِ اربابِ رہِ دیں بھی چلی جائے

ان لوگوں کو نہ خدا یاد ہے نہ اپنی قبر، ان کے دل میں خدا کی عظمت کا تصور یوں بٹھاتا ہوں ؎ غ

خدا کے باب میں کیا آپ مجھ سے بحث کرتے ہیں
خدا وہ ہے کہ جس کے حکم سے صاحب بھی مرتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ اب زمانہ حساس اور غیر تمند شخص کے جینے کا نہ رہا ؎

اکڑ ہیں تو اپنی تہ میں مجھ کو جائے گور دے وہ رہے زیرِ فلک اللہ جس کو زور دے

غ

خوب تکلیفیں اٹھائیں نزع میں رگڑے گئے　　ہم مگر خوش ہیں کہ دنیا کے وہ سب جھگڑے گئے

۲۸ر فروری ۱۹۲۱ء

میں نے عرض کیا کہ شاہ دل گیر صاحب کا خط آیا ہے، انھوں نے شکایت لکھی ہے کہ آپ نے ان کے خط کا جواب نہیں دیا۔ کچھ غیر مطبوعہ اشعار مانگتے ہیں۔ اگر آپ لکھا دیں تو روانہ کر دوں۔ چند اشعار منتخب کر کے فرمایا یہ بھیج دیجیے مگر صاحب یہ اخبار و رسائل والے لوگ میرے اشعار تکمیلِ ذوق اور تسکینِ تشنگی کے لیے نہیں مانگتے اس خیال سے مانگتے ہیں کہ جس پرچے میں یہ اشعار شایع ہوتے رہیں گے اس کی خواہش اور مانگ زیادہ ہوگی۔ تھوڑی دیر بعد فرمایا ایک اور اچھا شعر ہو گیا ان اشعار کے بعد آخر میں اسے بھی لکھ دیجیے میں نے عرض کیا: بہت اچھا فرمایئے۔ فرمایا ؎

یہ پرچہ جس میں چند اشعار ہیں ارسال خدمت ہے
ہمارے لختِ دل ہیں آپ کا مالِ تجارت ہیں

فرمایا: انگریز ہندستان کے اختلاف کا مقابلہ کر ہی رہے تھے اب خود ان کے گھر میں آگ لگ گئی ہے اور آیرلینڈ نے پریشان کر دیا ہے حقیقت یہ ہے کوئی طاقت زمانے کی ہوا سے نہیں لڑ سکتی ؎ غ

قوی تر کے مقابل سر کو خم کرنا ہی پڑتا ہے　　قضا آتی ہے تو صاحب کو بھی مرنا ہی پڑتا ہے

فرمایا: دوسرا شعر سنو ؎

باز آتے ہیں وہ پھر بھی کب اپنی بازیوں سے
پیکِ قضا ہے بنخود جدت طرازیوں سے

۱۳ر اپریل ۱۹۲۱ء

مشورہ

فرمایا: بعض احباب نے مہاتما جی کو مشورہ دیا تھا کہ شملہ جاکر وائسرائے لارڈ ریڈنگ صاحب سے مل لو۔ سُنا ہے وہاں سے واپس آئے ہیں تو ان احباب کی نادانی یا غلط مشورے پر متاسف ہیں کہ مولانا محمد علی کے دل میں فرق پڑ گیا اور ہندو مسلم اتحاد متاثر ہوا ؎ غ

واپسی گاندھی کی سُن کر شملۂ پر نور سے | یاد آئی واپسی موسیٰ کی کوہِ طور سے

فرمایا: حکومت دوست لوگوں پر بھی طعن و تشنیع کرنا اچھا نہیں، وہ بھی سوسائٹی کے رکن ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں اس خیال کے تحت کر رہے ہیں کہ ان کا اور ان کی قوم کا اسی میں فائدہ ہے۔ ممکن ہے اپنے اس طریقے کو دل سے پسند نہ کرتے ہوں ؎

خوشامد اک بت سفّاک کی کس کو خوش آتی ہے
کوئی کیا شوق سے کرتا ہے مجبوری کراتی ہے

ہم کو کیا حق ہے کہ کسی کو خود غرض اور منافق کہیں۔ شاید ان کو غرض اور مصلحت اس سے زیادہ پیاری ہو جتنے ہمیں عشرت ہیں۔ ہماری تو جیسی گزر گئی، گزر گئی موجودہ تعلیم نے آیندہ نسلوں کی ذہنیت اور عقیدے کا بالکل ناس لگا دیا ہے۔ دیکھو میں نے فارسی کے اس شعر پر اپنے مصرعے لگا کر اس سے اپنے مفید مطلب کیسا کام لیا ہے ؎

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست | ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

کہتا ہوں ؎

جب کہا ختنہ کو تو طفلِ مسلماں نے کہا | کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
جب جنیو کو کہا طفلِ برہمن بول اٹھا | ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

میں نے بہت داد دی اور عرض کیا کہ یہ معمولی لیاقت کی بات نہیں کہ کسی

دوسرے کے کلمے کو اپنی زبان سے اس طرح پیش کر دیا جائے کہ معنی میں زمین آسمان کا فرق ہو جائے اور مطالب بھی اپنے مفیدِ مقصد پیدا ہو جائیں آپ نے مصرع لگا کر رنگ اور مسلمانی میں نئی جان ڈال دی۔ نپولین نے جب ماسکو پر فوج کشی کی ہے تو روسی جنرل نے اس سے کہا۔ بونا پارٹ! ہماری تمہاری جنگ میں خیال کا بہت بڑا فرق ہے یاد رکھو تم یہاں سے کامیاب نہیں جا سکتے تم دولت کے لیے لڑ رہے ہو اور ہم آبرو کے لیے۔ نپولین نے مخالف کا کلمہ اسی پر یوں پلٹ دیا " ہاں سچ ہے جو جس کے پاس نہیں ہوتی اس کے لیے لڑتا ہے" (مراد یہ کہ ہم دولت سے محروم ہیں اور تم آبرو سے)

۱۸ / اپریل ۱۹۲۱ء

فرمایا محمد علی شوکت علی کے قید کیے جانے سے دل کو دکھ ہوا اور یہ اشعار نکل گئے :

بیادِ رنجِ یارانِ نظر بند | کیا ہم نے بھی اب ملنے کا در بند
زباں ہے ناتوانی سے اگر بند | مرے دل پر نہیں معنی کے در بند

فرمایا: پنجاب کے مارشل لا کے احساس نے یہ شعر کہلوایا ؎

زبان بند ہے اس عہد پر نگاہ کے بعد | سکوت ہی مجھے رہنا ہے اب تو آہ کے بعد

فرمایا: یورپین سیاست نے ترکی اور ایران کو تباہ کیا اس پر چیتاں کی شکل میں نظم دیکھیے ؎

سر تراشا اُن کا، کاٹا اُن کا پانو | وہ ہوئے ٹھنڈے، گئے یہ بھی پگھل
شیخ کو یخ کر دیا مومن کو موم | دونوں کی حالت گئی آخر بدل

دوسری چیتاں دیکھو ؎

دکھا رہی ہے یہ ترکیب حسنِ طبعِ سلیم | علی کی نم میں جگہ ہو تو بس ہے یہ تعلیم

ہماری تعلیم کا آج کل ایسا ناس لگا ہی کہ کام کی بات ہم کو ایک نہیں آتی ہم یہ نہیں جانتے کہ ملک کی خام پیداوار کیسی برباد کی جارہی ہی اور اس کو کس طرح سفید بنائیں۔ اگر جانتے ہیں تو ڈاروِن اور ہکسلے کے فلسفے میں وقت ضائع کرنا اور سوچتے بیٹھنا کہ ہمارے جدِّ اعلیٰ حضرتِ میمون تھے یا حضرت آدمؑ سے

ہمارے کھیت سے لے جاتے ہیں بندر چنے کیوں کر
یہ بحث اچھی ہی اس سے حضرتِ آدم بنے کیوں کر

فرمایا بعض مذہبی پیشوا اعلانات کی حد تک بڑے پُرخلوص اور پرجوش معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جب زرا عمیق نگاہ سے کام لیجیے تو صاف خود غرض اور جاہ طلب نظر آتے ہیں سے غ

بظاہر تھا براقِ راہِ عرفاں   چو دُم برداشتم لیڈر برآمد

۲۴ر اپریل ۱۹۲۱ء

فرمایا ایک مغرب پرست اور حکومت دوست خان بہادر صاحب کے انتقال پر دہلی کے بعض مسلمان بگڑ گئے کہ اس میت کو ہم مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیں گے اس سے مجھے بڑی عبرت ہوئی اور یہ شعر نکل گیا سے

تھے معزز شخص لیکن ان کی لائف کیا کہوں
گفتنی درجِ گزٹ باقی جو ہی ناگفتنی

فرمایا مادرِ ہند کو اس پر افسوس آتا ہی میرے فرزند اگر مفلس نہ ہوتے تو چند سکّوں کے عوض میں باہر ملکوں میں جا کر کیوں کٹ جایا کرتے اس مفہوم کو ادا کرنے کے واسطے میرے ذہن میں مرغی کی مثال آئی۔ مرغی اس امید

میں انڈے دیتی ہے کہ ان سے بچے نکلیں گے لیکن ان کی بدنصیبی دیکھو کہ اس کے
انڈے بارکوں میں فروخت ہو کر فوجیوں کا لقمہ بن جاتے ہیں۔ غرض کہ اس
مفہوم کو یوں ادا کر دیا ہے ؎
مرغی نے کہا کل یہ کسی کیمپ میں ٹپکے انڈا وہی اچھا ہے کہ بچہ جسے کھٹکے
ترکی کی تباہی کا خیال آیا تو اس زمین میں یہ شعر نکل گیا ؎
دیوارِ شکستہ نے بلندی کی دعا کی گردوں کی عنایت سے سڑک بن گئی کٹ کے
فرمایا میرے ذہن میں پہلے یہ مصرع آیا تھا۔ غ
جو چھنتا منی ہے وہ گنتا منی ہے
آخر اس کو چار مصرعوں میں یوں پھیلا دیا ہے۔ ع
کہاں اردو و ہندی میں زیرِ نقد وہی اچھا ہے جو گنتا منی ہے
مرے نزدیک تو بے سود یہ بحث میانِ ہمدم وچھنتا منی ہے

۸ رمئی ۱۹۲۱ء

سید صاحب نے مجھے اور سید نور الحسن صاحب سب رجسٹرار کو دعوت دی تھی کہ ۸ رمئی کی شام کو ہم دونوں کھانا ان کے ساتھ کھائیں۔ ہم دونوں کے جانے میں کچھ دیر ہو گئی سید صاحب نے حالتِ انتظار سے بیزار ہو کر ایک پوسٹ کارڈ نور الحسن صاحب کے نام لکھ کر ڈاک میں ڈال دیا:-

"خدا کے بندو! بی نیدھا (ملازمہ) نے بہت اہتمام سے دو چار ہانڈیاں تیار کیں۔ ۹ بج گئے لیے بیٹھی ہیں جھنجلا رہی ہیں میں کہتا ہوں کہ پلاؤ مزعفر تو ہے نہیں گوشت ترکاری بورانی کی بات ہی کیا! لیکن دل میں کہہ رہا ہوں کہ ایسی وعدہ خلافی اور بے پروائی چہ معنی دارد؟ قمر الدین صاحب کو تسلیم" ہم دونوں رات کو ۹ بجے کے بعد پہنچے تو سید صاحب نے شکوہ

کیا اور کارڈ لکھ دینے کا تذکرہ فرمایا جو ہمیں دوسرے دن ملا۔ میز پر کھانا چنا گیا سید صاحب کے بہنوئی راجا میاں صاحب بھی شریک تھے کھانے میں چپاتی، قورمہ، فیرینی اور بورانی تھی۔ سید صاحب نے اپنے لیے چھوٹی چھوٹی خستہ روغنی ٹکیاں تیار کرائی تھیں، ان ہی کو زیادہ تر بورانی سے کھاتے رہے مشکل سے ڈھائی تین چھٹانک غذا کھائی ہوگی میں نے دریافت کیا کہ کیا سب کھانا نیدھانے پکایا ہے؟ فرمایا: ہاں۔ اب کھانے کا لطف کیا ہے کھانوں کی لذّت اور دسترخوان کی نفاست تو عشرت حسین کی والدہ اپنے ساتھ لے گئیں اُن کی زندگی میں اس عشرت منزل میں چار چار باورچی کھانا پکاتے تھے۔ شاید ہی کوئی وقت ایسا گزرتا ہو جو کوئی نہ کوئی مہمان رہتا ہو ہائے اب تو ؎

چل بسے اسبابِ غفلت چشمِ عبرت رہ چکی میری ہستی تھی ہی کیا اور تھی جو کچھ وہ ہو چکی

۱۷ مئی ۱۹۲۱ء

فرمایا: بعض مسلمان ہنود سے اس لیے میل کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی مدد اور قوت سے مٹی ہوئی خلافت بحال کرنے میں سہولت ہوگی۔ اُن سے کہتا ہوں

نیک ہو منزل تو اکبر راہِ بد کیوں مانگیے دوست کے ملنے کی دشمن سے مدد کیوں مانگیے

فرمایا حکومت کا ناز اور غرّہ سب حق بجانب ہے اس کی اتنی خطا نہیں ہے جتنی ہماری ہے۔ ہم حریص اور جاہ طلب ہیں اس لیے حکومت مغرور ہے ؎

ہے بتوں کی خودنمائی میری غفلتوں سے پیدا میں اگر نظر نہ کرتا تو وہ کیوں سنگار کرتے

مسٹر سنہا بے وجہ گورنر اور سر نہیں بنائے گئے جو کوئی حکومت دوستی کا ایسا ثبوت دے گا اسے ضرور صلہ ملے گا۔ اس مضمون کو یوں دیا کر کہا ہے ؎

خدا کے گھر سے اب آنر کی جو خبر آئے بتوں کے پاؤں پہ ہم کو تو سر نظر آئے

میں نے عرض کیا کہ آپ نے یہاں بھی وہی کمالِ فن دکھایا ہے جو اس شعر میں ظاہر کیا تھا ؎

یوں تو ہیں جتنے شگوفے سب کو فکرِ باغ ہے یہ مگر سچ ہے کہ لالہ ہی کے دل میں داغ ہے

وہاں لالہ سے تو یہاں آنر اور سر سے آنریبل سر سنہا کی طرف خیال منتقل کیا ہے

فرمایا اب اس خیال کا عکس دیکھو ؎

جس کے دل میں شانِ باری کا تصور گھر کرے ان کو کیا پروہ کہ کوئی مُحت مسرا آنر کرے

۹ر جولائی ۱۹۲۱ء

میں ڈیڑھ ماہ کے واسطے بدایوں چلا گیا تھا۔ اس لیے سید صاحب کے پاس حاضر نہ ہو سکا خطوط آتے جاتے رہے اس زمانے میں مجھے بھی باوجود اس کے کہ وطن میں تھا اس کا خاص احساس ہوتا رہا کہ کسی بڑے آبشارِ مسرت سے دور ہو گیا ہوں۔ سید صاحب کو بھی یہ زمانہ بہت کھل گیا (جیسا کہ ۱۲ر جون ۱۹۲۱ء والے خط کی عبارت سے ظاہر ہے جو مجھے پرتاب گڑھ سے بدایوں بھیجا تھا) اب آیا تو جی کھول کر اشعار سنائے اور باتیں کیں۔ فرمایا جو لوگ اُردو فارسی رسم الخط پر اعتراض کرتے ہیں اور ہندی کے مطبوعہ اور ٹائپ شدہ خط کو ترجیح دیتے ہیں وہ ہندی کی ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر کے نقص کو نہیں دیکھتے کہ ایسی تحریر کسی طرح سمجھ ہی میں نہیں آتی کہ لکھا کیا ہے۔ میں نے ان لوگوں کا مذاق اڑایا ہے ؎

بھائیو تم بھی ہندی کے مخالف نہ بنو مر کے سمجھا ہوں میں اتنا کہ یہ تھی کام کی بات

بس کہ تھا نامۂ اعمال مرا ہندی میں کوئی پڑھ ہی نہ سکا ہو گئی فی الفور نجات

فرمایا میرے ایک دوست مولوی محمد عسکری صاحب ایک ریاست میں کوتوال ہیں وہ اُردو کی خدمت کا شوق رکھتے ہیں۔ دیکھیے میں سلے اُردو اور

ہندی کا موازنہ ایک شعر میں کیسا کیا ہے ؎

اٹھیں اُردو کی طرفداری میں بھائی عسکری ہم تو کہتے ہیں بتوں سے جس کہا تو تس کری

میں نے عرض کیا کہ "ہم تو کہتے ہیں" کے مقابلے میں جس کہا تو تس کری " (جیسا تو کہے گا ویسا کروں گا) رکھ کر دونوں زبانوں کی گفتگو کے آداب کیا خوب آئینہ کیے ہیں۔ لیکن اس شعر میں سب سے زیادہ قابلِ داد آپ کے قافیے کی تلاش ہے۔ فرمایا: مسلمانوں اور ہندوؤں کے تمدن کا فرق دیکھو ؎

وہ بغداد میں ہیں میں مندر میں گم ہوں شترغمزہ وہ ہیں تو میں گاؤدم ہوں

میں نے عرض کیا کہ آپ کے شترغمزہ اور گاؤدم کے شوق نے مطلب کو گول کر دیا۔ میں نہیں سمجھا کہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ فرمایا مجھے خیال یہ پیدا ہوا کہ حکومت برطانیہ نے ہندستان میں آرام و آسایش کے سامان بہم پہنچا کر ہم کو احدی بنا دیا اب وہی حمل و نقل کی آسانیاں عرب میں پیدا کر رہے ہیں گاڑی دیکھ کر اب عربوں کے بھی پیر پھولتے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا یہ خیالات آپ کا یہ شعر تو ظاہر کرتا نہیں۔ فرمایا میں نے ان خیالات کو ایک اور جگہ دوسری طرح سے صاف کیا ہے ہندو مسلمان ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ ہم اپنی مہمل باتوں کو نہ چھوڑیں اور تم اپنے اسی قدیم دائرۂ تمدن میں کولھو کے بیل بنے رہو دونوں کی اس فضولی سے حکومت خوش ہے ؎

ہم گیّا کے دھوئیں سینگ تم سرحد پر بیچو ہینگ
صاحب لوگ یہاں کی نعمت چکھیں فاردی ٹایم بینگ

میں نے عرض کیا سینگ کا قافیہ بی انگ Being کیسے درست ہو سکتا ہے؟ فرمایا: پھر آپ عروضی ہجے پر اُتر آئے اچھا ان خیالات کو چھوڑو، ایک عارفانہ شعر سنو ؎

حشر تک کھل نہ سکے راز اسے کہتے ہیں جستجو پھر بھی کرو تا زا سے کہتے ہیں

میں نے تعریف کی۔ فرمایا: دوسرے شعرا جو غیروں کے خیالات نظم کرتے ہیں
اور خود جذبات سے کورے ہوتے ہیں ان کی ایسی حالت ہوتی ہے کہ ؎

صورتِ لیلیٰ نہ دیکھی پڑھ لیا دیوانِ قیس شاعری آئی نہیں لیکن زباں داں ہو گئے

۱۲؍ جولائی ۱۹۲۱ء

میں مولوی مقبول احمد صاحب سر رشتہ دار کمشنری الہ آباد کے ساتھ
عشرت منزل پہنچا۔ سید صاحب نے فرمایا میں نے ایک بزرگ شاہ عبدالغفور
صاحب کا نام کسی اخبار یا رسالے میں پڑھا تھا اس کے بعد میں نے خواب میں
دیکھا کہ شاہ عبدالغفور صاحب میرے پاس آئے ہیں اور انھوں نے میرا جسم
اپنے ہاتھ سے دُھلایا ہے۔ بیدار ہو کر میں نے شاہ دل گیر صاحب کو خط لکھا کہ عبدالغفور
شاہ صاحب کون بزرگ ہیں۔ آپ کو علم ہو تو اُن کا پتا لکھیے ۔ پتا آ گیا تو میں
نے شاہ عبدالغفور صاحب کو ایک خط لکھا اور بلایا خط پا کر وہ خود تو نہیں آئے
کچھ اپنی تصنیفات بھیجیں اور حالات لکھے یہ معلوم ہو کر کہ شاہ صاحب خلافت
کے پُر جوش کارکن ہیں میں ڈرا کہ اگر یہ آ گئے تو کہیں گورمنٹ کی طرف سے
میں شک و شبہہ کا مرکز نہ بن جاؤں لہذا میں نے ان کو اپنی علالت کا ذکر
کرتے ہوئے روک دیا اور لکھا کہ پھر کبھی دوسرے وقت تکلیف دوں گا۔ فرمایا
اس مرتبہ پرتاب گڑھ جا کر مجھے بہت وحشت ہوئی بارش کی وجہ سے بنگلا
جزیرہ بن گیا تھا ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا میں نے عرض کیا آپ نے
انگریزی شاعر شیلی کے اس شعر کے پہلے مصرع کا پورا ترجمہ کر دیا۔

Water water every where

And not a drop to drink

فرمایا کہ کیا بتاؤں کہ وہاں کس تکلیفِ خیال کے ساتھ وقت کاٹا۔ میں نے عرض کیا: مشکل سے وقت کاٹنے پر خیال آیا ریاضؔ خیرآبادی اپنے مخصوص مضمون شراب پر فرماتے ہیں ؎

روزے رکھ کر بلا کے دن کاٹے ہیں　　مے سے دامن بچا کے دن کاٹے ہیں
میخانے میں ہم تشنہ لبوں نے ساقی　　سینے سے سبو لگا کے دن کاٹے ہیں

۲ر اگست ۱۹۲۱ء

فرمایا: موجودہ طریقۂ تعلیم میں ترمیم کی بہت ضرورت ہے اس نے ہم کو نکما، بزدل اور پست ذہنیت کا بنا دیا اس تعلیم کو حاصل کرتے ہم کو ایک صدی ہوگئی اور اب تک اپنے ہاتھ سے ایک سوئی بنانا نہیں آیا۔ آئی تو خوشامد اور ضمیر فروشی ؎

دلی خواہش تو ہے بیشک کہ ایک اور ایک دو کہیے
مگر کہنے کو ہوں موجود سب کچھ آپ جو کہیے

مرے طرزِ عمل سے اب تو نہ بھائی خوش ہیں نہ باپ خوش ہیں
مگر سمجھتا ہوں اس کو اچھا دلیل یہ ہے کہ آپ خوش ہیں

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے نری بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

مسلمانوں کی اخلاقی حالت اہلِ ہنود سے پست ہے ؎

جو پوچھا مجھ سے دورِ چرخ نے کیا تو مسلماں ہے
میں گھبرایا کہ اس دریافت میں کیا رمزِ پنہاں ہے
کروں اقرار تو شاید یہ بے مہری کرے مجھ سے
اگر انکار کرتا ہوں تو خوفِ قہرِ یزداں ہے

بالآخر کہہ دیا میں نے کہ گو مسلم تو ہی بندہ
ولیکن مولوی ہرگز نہیں ہو غانسا ماں ہی

حکومت بھی ہماری اس منافقت سے اور جذبۂ خودپسندی سے بیزار ہی ؎
کرتا ہوں ہر اینٹ پر نوحے رُکا رہتا ہی کام   تنگ ہی وہ شوخ مجھ تاریخ داں مزدور سے
فرمایا یہ شعر میں نے فارسی کے اس شعر سے متاثر ہوکر کہا تھا ؎
ہر کجا افتادہ بینی خشت در ویرانۂ   ہست فردا دفترِ احوالِ صاحب خانۂ

فرمایا بعض لوگ گاندھی جی کے Passive resi tanee (مقاومتِ مجہول) پر ہنستے ہیں مگر غور کیجیے تو یہ اہلِ دل کی بددعا کا سا بہت موثر حربہ ہی۔ خواجہ حسن نظامی صاحب کے دادا غدر میں پکڑے گئے صاحب نے پوچھا تمھارے ہتھیار کہاں ہیں جیب میں سے تسبیح نکال کر پیش کردی کہ یہ ہیں۔ دل کے بجائے دماغ پر ایمان رکھنے والے شورش پسند مخالفین کو میں ان اشعار میں جواب دیتا ہوں ؎

میں کب کہتا ہوں اے واعظ کہ میں نے کارِ دیں سمجھا
مگر اتنا سمجھتا ہوں کہ تو بھی کچھ نہیں سمجھا

بے کار ہی سکوں تو تلاطم بھی کچھ نہیں
ہم کچھ نہیں یہ سچ ہی مگر تم بھی کچھ نہیں

میں نے عرض کیا خوب آپ بظاہر اپنی اہمیت سے انکار کر رہے ہیں لیکن حقیقت میں اہمیت ثابت کر رہے ہیں کہ ہم سب کچھ ہیں۔ ایک دوسری جگہ بھی آپ نے انکار کے پردے میں ایک لطیف خودستائی چھپائی ہی ؎

تعلّی کی نہیں لیتے ہم ایسے ہیں ہم ایسے ہیں
مگر ہم جتنے ہیں بیزار دنیا سے کم ایسے ہیں

فرمایا ماشاء اللہ آپ نے خوب یاد رکھا۔ اچھا خودستائی کا ایک شعر اور سنیئے ؎

کب میں کہتا ہوں جنون میں ہیں تیرے کامل اکبر　　مگر انصاف سے کہیے کوئی اتنا بھی تو ہو

انکار کے پہلو میں اقرار ایک دوسری جگہ دیکھیے ؎

کل مدح مری وہ کرتے تھے اور بزم میں میں شرمندہ تھا
میں کچھ بھی نہ تھا اور تھا بھی اگر اس وقت میں تھا جب تو نہ تھا

میں نے تعریف کی کہ کیا پیارے ٹکڑے ہیں اور کیا برجستگی ہے۔ فرمایا برجستگی اس مطلع میں دیکھیے ؎

جس طرف اٹھ گئی ہیں آہیں ہیں　　چشم بد دور کیا نگاہیں ہیں

فرمایا: بالشویک لوگوں نے زار کی صدیوں کی جمی ہوئی سلطنت مٹی میں ملادی اس کو میں حکومت زار کے مظالم پر ایک عتاب خداوندی سمجھتا ہوں۔ دیکھیے میں نے اسی پر کہا ہے ؎

آسمانی توپ چلتی ہے کبھی صدیوں کے بعد　　لیکن اڑجاتی ہیں ساری غفلتیں اک فیر میں

رات زیادہ ہوگئی تھی میں نے اجازت چاہی۔ فرمایا: آپ آ جاتے ہیں تو دل بہل جاتا ہے اگر ہو سکے تو کل بھی آئیے بلکہ کھانا بھی ساتھ ہی کھائیے۔ میں نے عرض کیا: ممکن ہوا تو حاضر خدمت ہوں گا مگر کھانے کے لیے میرا انتظار نہ فرمائیے۔

۲۴ راگست ۱۹۲۱ء

فرمایا: آپ اچھے آگئے میں آپ کو یاد ہی کر رہا تھا۔ میں نے کہا ارشاد فرمایا: دیکھیے یہ گاندھی نامہ میں مرتب کرنا چاہتا ہوں آپ اس خاکہ کے بموجب اس سفید کاغذ پر سطور کھینچ دیجیے میرا ہاتھ کانپتا ہے۔ میں نے حسب ارشاد خاکہ تیار کر دیا سہ پہر کا وقت تھا مگر مچھر اس کثرت سے تھے کہ بیٹھنا دشوار ہوگیا۔ فرمایا

آپ کو مچھر بے چین کر رہے ہیں۔ مجھ کو تو نظر بھی نہیں آتے موزہ اتار کر دکھایا کہ دیکھیے میرے پیر کو کاٹ کاٹ کر کیا حال کیا ہے مگر مجھ کو تو اب تکلیف کا احساس بھی جاتا رہا کیڑے مکوڑوں نے بھی دیکھ لیا ہے کہ اس سے زیادہ مجبور اور کون ملے گا ؂ غ

مرگ کا خطرہ مبارک ہو انھیں جو زندہ ہیں　　ہم تو مردہ ہیں قیامت کی ہمیں امید ہے

میں نے تعریف کی۔ فرمایا: اس شعر میں زرا ذومعنی لطف دیکھیے ؂ غ

لذتِ شہرت لیے جاتی ہے سب کو سوئے جہل

ہوم رولی خوان پر یہ لطف جیسلی دیکھیے

۲۸ راگست ۱۹۲۱ء

مغرب کے قریب حاضر ہوا پوچھا اس وقت آپ کیسے آ گئے یہ وقت تو آپ کا افغان شہزادوں کی ٹیوشن کا تھا۔ میں نے عرض کیا ہاں چوک میں کچھ خرید و فروخت کرنا تھا۔ فرمایا فروخت کو تو نہیں اگر کچھ ہے تو خریدنے کو میں تیار ہوں۔ میں نے عرض کیا خود فروخت ہونے کو حاضر ہوں ؂

کوئی تشریف لا کر مول لے لے　　مری قیمت ہے ایک آنا کسی کا

(عالی بدایونی)

ذومعنی "آنے" کی داد دی۔ میں نے عرض کیا کہ عبدالرحیم خانخاناں کی زبان سے میرا دوسرا جواب ملاحظہ فرمائیے ؂

مرا فروخت محبت دے نمی دانم　　کہ مشتری چہ کس است و بہائے من چند است

شعر سن کر خوش ہوئے۔ فرمایا اچھا ہوا آپ آ گئے اب اطمینان سے بیٹھیے۔ آپ نے کھانا کھایا: میں نے عرض کیا۔ ہاں کھا کر آیا ہوں۔ فرمایا تو اچھا مٹھائی کھائیے یہ کہہ کر اندر سے پانچ گلاب جامنیں منگوائیں۔ میں نے کہا آپ بھی کھائیں

فرمایا میں نہیں کھا سکتا، مجھے سخت پیچش ہے۔ میں نے پوچھا کب سے فرمایا آج چار دن
سے کچھ معمولی سی خلش تھی پرسوں میں ہمشیرہ کے یہاں گیا وہاں پیٹ میں ایسی مروڑ
ہوئی کہ تکلیف کو ضبط نہ کر سکا۔ حکیم محمد فخر صاحب کو وہیں بلایا انھوں نے نسخہ لکھا
ہمشیرہ نے وہیں تیار کر کے پلایا جب ذرا درد کم ہوا تو میں نے واپسی کا ارادہ
کیا مگر پیدل نہ آ سکا اتنے سے فاصلے کے لیے آٹھ آنے شکرم کے کرایے کے دیے
شب کو کھانے میں بھی بے احتیاطی ہوئی، بی نیدھا نے بینگنوں کا بھرتا بنا رکھا
تھا اس سے پیٹ کے درد میں پھر زیادتی ہو گئی، رات بھر تکلیف سے کٹی۔
میں نے عرض کیا آپ نے غضب کیا پیچش میں بینگنوں کا بھرتا کھایا فرمایا ہاں
مولوی فخر صاحب کو آج صبح پھر بلایا تھا وہ بھی تعجب کرتے تھے مگر مجھے خیال
نہ تھا کہ اتنا نقصان کر جائے گا۔ میں نے کہا بینگن کے مضر اثر سے آپ اصولاً
تو واقف تھے خود فرماتے ہیں ؎

سینۂ مس کا ابھار اے دل فساد انگیز ہے — لوگ سچ کہتے ہیں بادنجان باد انگیز ہے

شعر سن کر ہنسنے لگے فرمایا رات کی تکلیف خدا کی پناہ معلوم ہوتا تھا کہ قبض روح
ہو رہا ہے بار بار پائخانے کو جاتا تھا مگر رتی رتی بھر آنو کے سوا کچھ خارج نہ ہوتا
تھا مسکرا کر فرمایا اس تکلیف اور مصیبت میں رات قدمچوں پر پائخانہ تو نہ
نکلا ایک شعر نکل گیا ؎ غ

مفت خفت ہوئی لوگوں سے کہ دوڑو ہیں چلا
نزع سمجھا تھا جسے قبض کی حالت نکلی

فرمایا اجی اب تو میں شاعری سے مصیبت میں پڑ گیا ہوں جو خیال بھی آتا ہے
نظم کی صورت اختیار کر لیتا ہے کہاں تک لکھے اور چھاپے جاؤں بہتر ہے کہ
خود ہی چھپ جاؤں۔ حافظ عبدالمعبود صاحب آ گئے اُن سے اپنے وہ اشعار

لحن کے ساتھ سنے یارے باشد، مزارے باشد۔ اخباری خبروں کے تذکرے پر فرمایا کہ گاندھی جی ابھی حکومت سے سچی لڑائی نہیں لڑ رہے ہیں ابھی تو طالب و مطلوب کی سی آپس کی ہاتھا پائی ہے کہ لاتیں مارنے اور کھانے میں ہر دو کو مزا آتا ہے اس لیے میں لوگوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ اس لڑائی میں حائل نہ ہوں ؎
طرح گاندھی و گورمنٹ کو برہم نہ کرو غ ہاتھا پائی ہے شب وصل کی کچھ غم نہ کرو
فرمایا اور سنو ؎ غ

نہ یہ دینی لڑائی ہے نہ سرکاری لڑائی ہے مری ان کی ابھی تو صرف بازاری لڑائی ہے

میں نے عرض کیا "بازاری" خوب فرمایا۔ عمّالِ حکومت سے زیادہ لنکا شائر کا بازار متاثر ہو رہا ہے۔ فرمایا ماشاء اللہ آپ نے خوب دیکھا معانی کے اس پہلو پر میں نے نظر نہیں کی تھی۔ فرمایا زرا اس شعر کو دیکھیے ؎ غ۔

گاندھی میں سب بھلائی لیکن وہ محض بے بس صاحب میں سب خرابی لیکن وہ خوب چوکس

میں نے عرض کیا کہ الفاظ کے کاروبار میں آپ کس غضب کی لیاقت کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ ادب کے گرے پڑے سنگریزوں کو ہاتھ میں لیتے ہی ہیرا بنا دیتے ہیں آپ نے اس شعر میں ؎

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

جس طرح ایک حقیر لفظ "فالتو" کو معزز بنا دیا تھا اسی طرح اب اس کے لفظ "چوکس" میں وہ چار چاند لگائے ہیں کہ حسنِ بیان منہ چومے لیتا ہے اس میں کیا کیا معنی بھرے ہیں۔ ع

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے
نہ کہنے پر تو آپ اتنا کہ جانتے ہیں کہ ؎
فسادِ سامعہ در موجِ کوثر و تسنیم

میری اس داد سے مسرور ہوئے فرمایا آپ نے ماشاءاللہ بہت عمیق نظر پائی ہے
اور خوب بات کی تہ کو پہنچ جاتے ہیں ۔ غ

بظاہر دیکھنے میں گو شریکِ کیمپ ہیں اکبر   مگر جس کو بصیرت ہے اسے پہچان جاتا ہے

فرمایا اس شعر کا عرفانی رنگ دیکھیے ۔ غ

اس کو نہ پا سکا مگر اس غم میں یار رو سکا   یہ بھی ہے اس کا شکر کہ اتنا تو ہو سکا

میں نے عرض کیا: بہت صحیح فرماتے ہیں   ع

جو خدا کی یاد آئے تو اسی کی مہربانی

فرمایا اب کمزوری اتنی ہو گئی ہے کہ بیٹھ جاتا ہوں تو اٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے
میں نے عرض کیا جلیل صاحب نے اس کمزوری کو اپنی ذہانت سے رحمت
قرار دیا ہے ۔

اٹھنے نہ دیا کسی کے در سے   احسان ہے مجھ پہ لاغری کا

فرمایا لاغری اور توانائی پر آپ کو میرا وہ شعر یاد نہیں ۔

ناتوانی میری دیکھی تو مصور نے کہا   ڈر ہے تم بھی کہیں کھنچ آؤ نہ تصویر کے ساتھ

میں نے عرض کیا جی ہاں بالکل نیا خیال ہے ایک ایرانی بھی گھلتے گھلتے مادیت
ہی کھو بیٹھا۔ حضرت عزرائیل کو تلاش کرنے میں مشکل ہوئی ۔

ملک الموت بیامد و مراجت نیافت   نالہ ہر چند خبر داد کہ در پیرہن است

باب چہارم

مرض الموت اور انتقال

میں سید صاحب کی اس پیچش کو مرض الموت بالکل نہ سمجھتا تھا خیال تھا کہ چند روز میں ٹھیک ہو جائیں گے۔ عُقلا نے غلط نہیں کہا ہے کہ مرض اور دشمن کو کسی حالت میں حقیر نہیں سمجھنا چاہیے مگر سید صاحب نے اس عمر میں مرض کو حقیر سمجھا کبھی زیادہ تکلیف محسوس کی تو حکیم فخر صاحب کو بلا کر دکھا دیا جو اپنی درویش طینتی سے خلقِ خدا کا علاج بغیر فیس کے کیا کرتے تھے۔ یونانی یا انگریزی دوا بھی پابندی سے نہیں پی تا ایں کہ مرض نے گور کنارے لگا دیا۔ ۱۲ ستمبر کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ حالت خطرناک ہے۔ پہلے باہر ملازم نے کہا کہ اندر ہیں، ہمشیرہ صاحبہ بھی موجود ہیں، کمزوری کے باعث اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو گیا ہے۔ میں نے اطلاع کرائی پردہ کرا دیا اور مجھے اندر بلا لیا۔ میں اندر پہنچا تو اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگے میں نے کہا آپ کیا غضب کر رہے ہیں، تکلف میں خود کو تکلیف میں ڈال رہے ہیں لیٹے رہیے اصرار کے باوجود نہیں مانے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ فرمایا میں لیٹے لیٹے بھی تھک گیا ہوں پرسوں آپ واپس چلے گئے تو مجھے اطلاع ہوئی، بہت افسوس رہا۔ بیماری کی حالت میں آپ لوگ بہت یاد آتے ہیں، یہاں تنہائی میں بی نیدھا سر پر گوز کرنے کو موجود ہیں آپ تنہا تو ہیں، یہیں کیوں نہیں آ جاتے۔ میں نے عرض کیا تنہا نہیں ہوں چھوٹا بھائی شمس الدین بھی ساتھ ہے۔ فرمایا ؎

سیہ خانہ وہی ہے اور وہی سوزِ غمِ فرقت مرے کس کام آیا آپ کا رشکِ قمر ہونا

خیر جلد جلد دیکھا کیجیے۔ نیدھا کے لڑکے ستار کو آواز دی اس سے کہا آپ کو وہ ناشپاتی دو جو بڑی تعریفی لائے ہو۔ وہ ناشپاتی کاٹ کر طشتری میں لایا خود بھی دو قاشیں کھائیں۔ فرمایا یہ بھی بڑا وضع کا پابند لڑکا ہے، کل ایک سیب منگوایا وہ بھی چھ پیسے میں لایا آج ایک ناشپاتی بھی چھ پیسے میں لایا ہیں نے اس سے کہا ارے بھائی کیا اندھیر کرتا ہے کیا راج چوپٹ کرے گا؟ یہ کہہ کر بے اختیار ہنس پڑے۔ فرمایا اب ہنسا بھی تو نہیں جاتا ہے

آرام کی تلاش نے رکھا ہے بے قرار ہر خواہشِ سکوں سببِ اضطراب ہے

میں نے عرض کیا آپ کی حالت بہت ردّی ہوتی جا رہی ہے۔ دوا کس کی پی رہے ہیں؟ فرمایا؟ میں دوا کا زیادہ قائل نہیں ہوں بیماری اپنا کورس پورا کر لیتی ہے تو خود چلی جاتی ہے ہے

طبیبوں کو تو اپنی فیس لینا اور دوا دینا خدا کا کام ہے فضل و کرم کرنا شفا دینا

فرمایا آپ کے "اندھیر نگری چوپٹ راجا" کے تسلسل کے خیال سے موپلا یاد آئے خوب لڑ رہے ہیں۔ کیوں نہ ہو عرب خون ہے دیکھیے میں نے اُن پر آج ایک شعر کہا ہے ہے غ

ڈنڈے سے دبتا ہے کب یہ موپلا اس سے لڑنے کو رفل لا توپ لا

میں نے عرض کیا اوّل تو ڈنڈے کی "ی" گرتی ہے دوسرے واقعے کے بھی خلاف ہے حکومت موپلاؤں کو ڈنڈے سے نہیں مار رہی ہے سر دست تو نمائشی خوف سے کام لے رہی ہے۔ فرمایا تو ڈنڈے کو "ڈانٹ" کر دیجیے۔ میں نے عرض کیا، میں دیکھ رہا ہوں میرے یہاں بیٹھنے سے مستورات کو پردے سے تکلیف ہو رہی ہے۔ اب اجازت دیجیے۔ فرمایا اچھا جائیے میری بیماری کی خبر

مولوی محمد حسین صاحب کو کرتے جائیے۔ میں مولوی محمد حسین صاحب سے ملا اُن سے کیفیت بیان کی انھوں نے دیکھنے کا وعدہ کیا۔ ۴ ستمبر کو عشرت منزل پہنچا تو مولوی محمد حسین صاحب موجود تھے سید صاحب گاڑھے کی ایک چادر آدھی اوڑھے آدھی باندھے ہوئے لیٹے تھے۔ جسم کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ اتنا سوکھا ہڈیوں کا پنجر جنجال کیسے ہے۔ فرمایا طاقت بہت زائل ہوگئی اب بیٹھا بھی نہیں جاتا ایک صاحب حصہ سوم کی کچھ جلدیں خریدنے آئے تھے یہ حصہ مولوی وحید احمد صاحب کے زیر اہتمام نقیب پریس بدایوں سے چھپ کر اسی ہفتے میں آیا تھا ایک دن کے واسطے مولوی سید عشرت حسین صاحب آئے ہوئے تھے سید صاحب نے ان کو بالا خانے سے بلوایا اور کہا کہ ان خریدار صاحب کو مطلوبہ جلدیں دے دو اور منشی صاحب سے حساب لکھوا دو اخباری خبروں کے سلسلے میں موپلاؤں کا ذکر آیا۔ فرمایا یہ لوگ تعداد میں کم، جاہل اور غیر منظم ہیں۔ برطانیہ جیسی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ حکومت نے اپنی مصلحت کے تحت جھگڑے کو خود طول دیا ہے کہ دنیا یہ سمجھے کہ اتنے شدید بلوے کو بھی حکومت نے دبالیا اس پر ایک لطیفہ سنایا فرمایا: ایک شخص ایک صحبت میں اپنی مردانگی کی ڈینگ مار رہا تھا کہ مجھ کو جنگل میں سات شیروں نے گھیر لیا تھا اُن سے جان بچا کر نکل آنا میرا ہی کام تھا ایک شخص نے کہا بات یقین میں نہیں آتی کہ سات شیر ایک جگہ ہوں اور زندہ چھوڑ دیں۔ بولا تو سات چیتے ہوں گے معترض نے کہا چیتے تو شیر سے بھی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں وہ تو آدمی کو درخت سے بھی کھینچ لاتے ہیں۔ کہنے لگا تو سات بڑے جنگلی کتے ہوں گے معترض نے کہا جنگلی کتے چھوٹے ہوتے ہیں اور ان جنگلی کتوں کو آپ نے کچھ کم خونخوار سمجھا ہے اجی یہ جس جگہ آجاتے ہیں وہاں سے شیر کو جان بچا کر نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کہنے لگا ممکن ہے میں اندھیرے میں اچھی طرح نہ دیکھ

سکا ہوں اور سات لومڑیاں ہوں۔ معترض نے کہا لومڑیاں کبھی گروہ میں نہیں رہتیں سات لومڑیوں کے یک جا ہونے کا امکان ہی نہیں ہے غرض کہ جرح اور تردید نے کچھ نہ چلنے دی تو آخر میں کہنے لگا اجی اصل بات یہ ہے کہ جنگل میں کچھ کھڑ بڑ ہوئی میں اندھیرے میں اچھی طرح دیکھ نہ سکا کہ تھا کیا تنہائی اور تاریکی کی حالت میں جنگل سے جان بچا کر آجانا بھی آپ کے نزدیک کچھ کم جرأت کا کام ہے یہ لطیفہ بیان کر کے تھوڑی دیر اور باتیں کرتے رہے میں اجازت چاہ کر چلا آیا ۵؍ ستمبر کو میں عشرت منزل نہ جا سکا حالت دریافت کرائی تو معلوم ہوا کہ دن بدن بجھتے جاتے ہیں عشرت حسین صاحب ۴؍ ستمبر کی شام کو اپنی ملازمت پر واپس چلے گئے تھے۔ میں ۷؍ ستمبر کو مغرب بعد پہنچا دیکھا تو نیم غافل تھے بخار نہ تھا نبض ٹھیک تھی مگر کم زور چل رہی تھی اضطراب کی حالت میں کبھی ہاتھ پیر کو حرکت دے رہے تھے۔ راجا میاں صاحب تنہا سرہانے بیٹھے مچھر اڑا رہے تھے۔ راجا میاں صاحب نے فرمایا کہ کبھی کبھی آنکھیں کھولتے ہیں تو عشرت کو دریافت کر لیتے ہیں کہ ابھی آئے یا نہیں۔ میں سامنے کرسی پر بیٹھ گیا تھوڑی دیر میں آنکھیں کھولیں۔ میں نے سلام کیا، پہچان کر ہاتھ سے سلام کا جواب دیا میں نے عرض کیا کہ اس وقت کی گاڑی سے جا کر میں عشرت حسین صاحب کو بلا لاؤں؟ تھوڑی دیر تک مجھے تکتے رہے کوئی جواب نہ دیا اور آنکھیں بند کر لیں راجا میاں صاحب نے کہا کہ صبح تار دیا تھا کوئی جواب نہیں آیا تو حمید کو بھیجا ہے اب آپ کا جانا بے کار ہے۔ میں تقریباً گھنٹے بھر تک خاموش اور متاسف بیٹھا رہا اتنی دیر کے بعد پھر آنکھیں کھولیں۔ مجھے تھوڑی تک غور سے دیکھتے رہے اس کے بعد بولے، آپ کو بہت دیر ہوگئی اب آپ جائیے۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر مجھے رخصتی سلام کیا۔ سیدھا پاس کھڑی تھی اس سے لے جاؤ

دروازہ بند کر لو اب مجھے کسی کو نہ دکھاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کے پلنگ کے قریب پائخانے کی چوکی ہے اس میں سے بدبو آرہی ہے میں آپ کے پلنگ کو پکڑ کر ذرا اس سے دور کر دیتا ہوں۔ کچھ جواب نہ دیا اور پھر غافل ہو گئے۔ میں نے اور راجامیاں نے پلنگ پکڑ واکر اس متعفن حصے سے دور کر دیا اس کے بعد میں چلا آیا صبح کو حالت دریافت کرائی تو معلوم ہوا کہ وہی نیم بیہوشی کی کیفیت ہے کوئی افاقہ نہیں ہے سید عشرت حسین صاحب آگئے ہیں۔ ۹ ستمبر کو شام کے وقت شہر جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ عشرت منزل سے راجامیاں صاحب کا رقعہ لے کر ایک آدمی آیا اس میں تحریر تھا کہ آج تین بجے شام کو میر اکبر حسین کا انتقال ہو گیا آہ کے ساتھ پرچہ ہاتھ سے نیچے گر گیا میں ایک حالتِ گم شدگی میں اس شعر کو پڑھ کر روح سے مخاطبت کرنے لگا ؎

رفتی و از رفتنت یک عالمے تاریک شد　　　　تو مگر شمعی چو رفتی بزم برہم ساختی

شام کو عشرت منزل پہنچا مولوی سید عشرت حسین صاحب اور خواجہ حسن نظامی صاحب موجود تھے۔ خواجہ صاحب تار پاکر آج ہی دن کے ۱۱ بجے پہنچ گئے تھے۔ فرمایا کہ میں پہنچا ہوں تو گویائی مفقود تھی مگر میرے ہاتھ چھونے اور دعا پڑھنے پر اپنے ہاتھ سے میرے ہاتھ کو دباتے جاتے تھے جس سے پتا چلتا تھا کہ حس باطنی موجود تھی میں نے اندر جا کر میت کا چہرہ دیکھا سر کے بال اتار دیے گئے تھے اب بھی معلوم ہوتا تھا کہ نیم باز آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں دل بھر آیا زیادہ نہ دیکھا گیا مولانا محمد کافی صاحب نے میت کو غسل دیا اور نمازِ جنازہ پڑھائی۔ نماز میں تقریباً ستر اور بعد کو جنازے کے ساتھ اہم نفوس تھے ان میں ڈاکٹر شاہ سلیمان صاحب ان کے مخصوص ملنے والے تھے۔ قبرستان کے بعد بارش کے خوف اور تاریکی کے باعث لوگ زیادہ شریک نہ ہو سکے چار گیس لائٹوں کا انتظام تھا۔ کالے ڈانڈے

کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ میرے بھائی حافظ حکیم نجم الدین مرحوم کے پوتے عاشق حسین نے اور بھانجوں نے قبر میں اتارا۔ قبر صندوقی تھی اس پر پتھر کی سلیں رکھ دی گئیں۔ ہائے اس کے بعد ؎

مٹھیوں میں خاک لے کر لوگ آئے بعدِ دفن　　زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

(ثاقب)

رات کے گیارہ بجے مرحوم کو قبر میں چھوڑ کر ہم سب واپس آئے میرا ایک شعر ہے ؎

عقبیٰ میں صرف توشۂ اعمال ساتھ ہے　　دنیا میں سارا رہ گیا سامانِ زندگی

عشرت منزل پر واپس ہونے کے بعد عاشق حسین سے معلوم ہوا کہ مولوی عشرت حسین صاحب نے آپس کے فساد کو رفع کرنے کے لیے وعدہ کیا ہے کہ متنازعہ امور ثالث مقرر کرکے طے کر دیے جائیں گے اور آٹھ ہزار کی رقم جو مرحوم نے بنک میں چھوڑی ہے آپس میں حصۂ رسد تقسیم کر لی جائے گی۔ عاشق حسین سے یہ معاملات سن رہا تھا اور مرحوم کے اس شعر کو ذہن میں دہرا رہا تھا ؎

کوئی مرے تو دیکھ کہ کیا لے گیا وہ ساتھ　　بے کار ہے یہ بحث کہ وہ چھوڑ گیا گیا

دوسرے دن شام کو عشرت منزل گیا مولوی عشرت حسین صاحب، نوح ناروی صاحب اور راجا میاں صاحب سے ملاقات ہوئی معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب دہلی واپس چلے گئے ۱۱ ستمبر کو سیوم کے واسطے چار حافظوں کو ساتھ لے کر صبح عشرت منزل گیا اکہتر نفوس سیوم کی فاتحہ میں تھے۔ زیادہ تعداد محمد کافی صاحب کے مدرسے کے طلبا کی تھی۔ پانچ کلام اللہ ختم ہوئے۔ مولوی ابو محمد صاحب نے تاریخ وفات کا مادہ سنایا۔ ع

کہ ساکت شد لسان العصر اکبر

میں نے بعد کو غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ مادہ غلط ہے۔ اس میں دو سو کے بقدر اعداد

زیادہ ہو جاتے ہیں۔

۱۵ ستمبر مولوی سید عشرت حسین صاحب نے حسب ذیل تاریخیں جانچنے کو دیں تمام درست پائیں :-

(۱) محرم میں لسانِ العصر اکبر بھی جناں پہنچے ۱۳۴۰ھ
از گوہر صاحب

(۲) مل گیا وہ آج ذاتِ پاک میں ۱۳۴۰ھ
از شیر علی صاحب شاعر

(۳) لسان العصر اکبر حسین صاحب اکبر ادیب جج الہ آبادی ۱۳۴۰ھ

(۴) تاریخ وفات اکبر ۱۹۲۱ء از حاجی سید احمد
فرستادہ الف دین صاحب وکیل

(۵) ہی پہنچا آج اکبر رحمتِ اللہ اکبر میں ۱۳۴۰ھ
از محمد اسمعیل صاحب مدرس

(۶) دیکھ اکبر مر گیا برپا قیامت ہوگئی ۱۳۴۰ھ
از محمد ہادی صاحب

۶ ستمبر کو مولوی سید عشرت حسین صاحب پرتاب گڑھ چلے گئے غرض کہ ؎

شمع کے گل ہوتے ہی پروانے سب رخصت ہوے
دفعتاً کیا تھا میانِ انجمن کیا ہوگیا

باب پنجم

تنقیدِ کلام

ابتداءً میرا خیال تھا کہ چونکہ کلامِ اکبر پر اس سے قبل ریویو مختلف رسائل وغیرہ میں کئی مرتبہ لکھ چکا ہوں، اب اس کا اعادہ نہ کروں۔ مگر بعض سخن فہم حضرات نے اصرار کیا بالخصوص مکرمی جناب ہاشمی صاحب نے مشورہ دیا کہ اس تالیف کی تکمیل کے واسطے اس باب کا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا اب ان پہلوؤں کو بچاتے ہوئے جن پر سابق میں روشنی ڈال چکا ہوں، مثلاً فلسفیانہ خیالات، عارفانہ نکات، اخلاق و مواعظت، مناظرِ قدرت، شوخی و ظرافت، اظہارِ فطرت، زبان کی سلاست و روانی، عاشقانہ شاعری و تغزل وغیرہ اور اُن خاص خاص سرخیوں کو چھوڑتے ہوئے جن کا حوالہ دیباچے میں دے چکا ہوں کلامِ اکبر کے کچھ دوسرے نمونے اور ان کے متعلق اپنے خیالات پیش کرتا ہوں۔

طنزیات ظرافت کی طرح طنز و تشنیع اکبر کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ گدگدانا ہو یا چٹکی لینا دونوں مقصد براری کے آلات ہیں۔ اور مواقع کے فرق کے ساتھ استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ بشری فطرت ہے کہ مجبور انسان طنز کے طپنچے چلاکر دل ٹھنڈا کرتا ہے۔ عورتیں اس میدان کی خاص مرد ہیں۔ قدما اور متاخرین میں مجھے کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس نے اس حربۂ طنز سے اکبر کی طرح خوبی اور کثرت سے کام لیا ہو۔ اکبر کی تشنیع میں آپ گریۂ بیوگان کی سی کم وقعتی یا بے کسی کہیں نہ پائیں گے۔ بات کو بم بنانا اور الفاظ کو بجلی کی طرح گرانا

ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ طنز کے معاملے میں ان کی گفتار کی گرمی اور کلام کی جگر شگافی ملاحظہ فرمائیے ؎

ذہنِ عالی اور ہے جمعیتِ دل اور ہے ۔۔۔ علمِ منزل اور ہے اور قربِ منزل اور ہے

اس مفہوم کو کہ انسان کو دماغ سے زیادہ دل اور عقل سے زیادہ ذوقِ صحیح کی ضرورت ہے ایک دوسری جگہ اس طرح بھی صاف کیا ہے ؎

خدا طالب نہیں تم سے مقفیٰ بات کرنے کا ۔۔۔ وہ اس سے خوش ہے جس کو شوق ہے خیرات کرنے کا

ہمیں تو خامشی میں اپنے دل سے کام لینا ہے ۔۔۔ ریاں وہ بزم میں کھولیں جنھیں انعام لینا ہے

نہایت خوش نما کھولی ہیں لٹیں آپ نے لیکن ۔۔۔ وہ رکھیں پاؤں جن کو اپنے سر الزام لینا ہے

صنعتِ تضاد اور مرعاۃ النظیر کے سلسلے میں دیکھیے کہ اکبر کو غصے میں بھی "سر" اور "پاؤں" کا کیسا ہوش ہے ؎

مبارک ان کو جو حالاتِ طبقاتِ زمیں سمجھے ۔۔۔ پہنچ وہ بھی گئے زیرِ زمیں جو کچھ نہیں سمجھے

زیرِ زمیں پہنچ جانے کا اشارہ کتنا بلیغ ہے۔ اس "معلوم شد کہ ہیچ معلوم نیست" کو دوسری جگہ یوں ظاہر کیا ہے ؎

ڈاکٹر تجربہ کرتا تھا ہوا میں رخصت ۔۔۔ مجھ سے وہ کہنے لگا آپ کدھر جاتے ہیں

کہہ دیا میں نے ہوا تجربہ مجھ کو تو یہی ۔۔۔ تجربہ ہو نہیں پاتا ہے کہ مر جاتے ہیں

کہاں اور کس طرف قائم کروگے یادگار ان کی

دمِ آخر یہ ذکر ان سے کر دیں لیکن کیا ہوگی

ظاہر میں خود پسند اور دنیا زدہ لوگوں پر دوسری جگہ افسوس ملاحظہ ہو ؎

ماسٹر ہیں نزع میں لڑکوں کی حالت دیکھیے ۔۔۔ ان کا فوٹو لیتے ہیں پڑھتے نہیں لیکن جائے

دل میں خاک اُڑتی ہے خالی ہے جولب دیکھیے | مذہب اب رخصت ہے بس تاریخ مذہب دیکھیے

دوزخ کے داخلے میں نہیں ان کو عذر کچھ | فوٹو کوئی لگا دے جو اُن کا بہشت میں

مدحتِ گفتار کو سمجھو نہ اخلاقی سند | خوب کہنا اور ہے اور خوب ہونا اور ہے

چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں | بات وہ ہے جو پائنیر میں چھپے

فقط سڑکوں سے تسکین نگاہِ چشم شرقی ہے | اندھیرا ہے گھروں میں راستوں میں لیمپ تی ہے

میری نسبت جو ہوا ارشاد وہ میں نے سنا | یہ تو کہیے اپنی نسبت آپ کی کیا رائے ہے

الفاظ کا انتخاب اور جل بھُن کر کہنے کا اسلوب دیکھیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شعر کی بجائے منہ سے آگ نکل رہی ہے۔ جامِ جمشید کو کاسۂ گلی اور کاسۂ گلی کو جامِ جمشید یوں بنایا جاتا ہے ؎

میں کب کہتا ہوں اے واعظ کہ میں نے کارِ دیں سمجھا
مگر اتنا سمجھتا ہوں کہ تو بھی کچھ نہیں سمجھا

بطلانِ حس کو کیسی لطیف چٹکی لے کر ظاہر کیا ہے ؎

خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذّب ہیں
حجاب اُن کو نہیں آتا انھیں غصّہ نہیں آتا

احساس کے باطل ہو جانے کے اسباب بھی قابلِ خیال ہیں فرماتے ہیں ؎

باپ ماں سے شیخ سے اللہ سے کیا اُن کو کام
ڈاکٹر جنوا گئے تعلیم دی سرکار نے

گزر ہوا اُن کا کیوں کر حلقۂ اللہ اکبر میں
رہے صاحب کے بنگلے پر رہے صاحب کے دفتر میں

"اہلِ تدبیر کی درماندگیاں" دیکھیے ؎

میری سمجھ میں تو یہی آیا نظر کے بعد
تحقیق علتوں کی یہاں ہے خبر کے بعد

جان ہی لینے کی حکمت میں ترقی دیکھی
موت کا روکنے والا کوئی پیدا نہ ہوا

حقائق نگاری

انیسویں صدی کے حقائق نگار مفکرین میں حالیؔ کے بعد فوراً اکبر پر نظر جاتی ہے۔ حق بات کہنے اور قوموں کو سربلندی کی طرف لے جانے میں دونوں خضرِ راہ بنے۔ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے واسطے راستے دونوں نے علیحدہ علیحدہ اختیار کیے۔ ایک جدت کا عاشقِ زار تھا تو دوسرا قدامت کا پرستار لیکن تنوعِ فکر اور بلندیِ تخیل سے دونوں یکساں مالامال تھے۔ راست گوئی سے قوموں کو متاثر کرنے کے واسطے حالیؔ ماضی پر روئے تو اکبر حال پر ہنسے۔ کہتے ہیں ؎

اولڈ مرزا ہر طرف بدنام ہیں
ینگ بڈھو وارثِ اسلام ہیں

اکبر کو جدت پسند مغرب زدہ نوجوانوں سے بڑا شکوہ یہ تھا کہ "باقی نہیں دلوں میں اللہ کا ادب کچھ" اس لیے ڈرتے تھے کہ "یہ نازنین جماعت غائب کرے گی سب کچھ" اللہ کا ادب تو بڑی چیز ہے۔ اکبر کو وہ فضا مسموم معلوم ہوتی تھی "کہ جن میں عزتِ نام محمد ہو نہیں سکتی" وہ اقبال کے گرگ نطشے کو (جس کے ملحدانہ اور مجنونانہ خیال کے مطابق خدا کا انتقال ہو چکا ہے) اخلاق کا طاعون سمجھتے تھے اور اس تہذیب کو روکنے کے واسطے حقائق و طنز کی آگ اچھالتے رہتے تھے کہ "تم سلامت رہو اللہ نہیں ہے نہ سہی" اور کہتے تھے ؎

ہے اختیار خود کو مختار تم سمجھ لو
لیکن ہوئے یقیناً بے اختیار پیدا

راست گو اکبر باطل کوش اور عرفاں سوز خیالات کو خواہ وہ برگسانی ہوں، فیسطائی ہوں یا اقبالی، ادب کا ادبار کوڑھ (برص)، اور عقیدے کا کوڑھ بتاتے تھے کہ "کالج کے کیڑے پڑ گئے دلق فقیر میں" مگر اس کو زبان کی سلاست کہیے یا حق گوئی کی طاقت کہ دشمن کو رنج کی بجائے رشک کرنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ انصاف یہ ہے کہ عروس فطرت کے چہرے سے پردہ اٹھا اٹھا کر اس کے صحیح خط و خال بے نقاب کرنا بڑے صاحبانِ عزم و نظر کا کام ہے۔ دیکھیے اکبر کی نگاہ عمیق نے کس کس طرح علم و حکمت کے ان نکتوں کا کھوج لگایا جہاں تک ہر شخص کی نظر بالکل نہیں پہنچتی۔

علمائے فلکیات کا اعلان ہے کہ فضائے بسیط کا عمق لا تناہی ہے۔ اس میں ہمارے نظام شمسی جیسے لاتعداد نظام ہیں اور آفتاب سے کروڑوں گنے بڑے دوسرے سورج اپنے مطیع سیّاروں اور اقمار کے ساتھ گشت لگا رہے ہیں۔ ہمارا نظام شمسی خود سماکِ رامح کی طرف ۱۳ میل فی سکنڈ کی رفتار سے کھنچا جا رہا ہے۔ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔ اس رفتار سے چل کر روشنی کرۂ ارض تک آتی ہے، تو منٹوں گھنٹوں دنوں یا مہینوں میں نہیں ہزاروں سال میں فضا کی مسافت طے کر کے پہنچ پاتی ہے۔ مثلاً کہکشاں ہی کو لیجیے یہ ہم سے ایک ہزار سال نوری کا فاصلے پر ہے یعنی اس کی روشنی ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ کے حساب سے چل کر ہم تک ۱۰ لاکھ سال میں پہنچتی ہے۔ بعض ستارے اتنے فاصلے پر ہیں کہ ان کی روشنی ابتدائے آفرینش سے چلنا شروع ہوئی ہے اور اب تک کرۂ ارض تک پہنچ نہیں پائی۔ ایسے بے پایاں فاصلے کی پیمائش اعداد کی مدد سے کرنا بالائے طاق ہے اس کا صحت کے ساتھ خیال میں لانا بھی ایک امر محال ہے۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ اس صدر نشینِ اعلیٰ حی و قیوم کی کرسی ہم سے کتنی دور ہوگی اکبر نے انسان کے علم اور خیال کی اس کوتاہی کو یوں ظاہر کیا ہے ؎

بزمِ جاناں کے تصور سے رہا میں قاصر — دُور کی بات تھی اندیشہ وہاں جا نہ سکا

اندیشہ و خیال کے متعلق مشہور ہے کہ ہر جگہ پہنچ جاتا ہے لیکن بوجہ بُعدِ مسافت اندیشہ بھی جہاں تک نہیں پہنچ سکتا وہ بزمِ جاناں ہے۔

کم سمجھ انسان نے اپنی تفہیم کی سہولت کے واسطے گزشتہ اور آیندہ (دی و فردا) کی اصطلاحات وضع کر لی ہیں ورنہ خالقِ مطلق کے علم میں نہ کوئی چیز ماضی ہے اور نہ مستقبل، وقت اور زمانے کے چکر کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا یہ دونوں اضافی چیزیں ہیں۔ ہم جس واقعے کو ماضی سمجھ رہے ہیں ممکن ہے دوسرے ستاروں کی مخلوق کے نزدیک وہ مستقبل ہو۔ سورج ہم سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کی روشنی ہم تک ۸ منٹ میں پہنچتی ہے۔ ستارہ سہیل کو لیجیے اس کی روشنی اسی مقررہ رفتار سے چل کر کرۂ ارض تک تقریباً سو سال میں پہنچتی ہے۔ کرۂ ارض پر ایک واقعہ یعنی غدر سنہ ۱۸۵۷ء تقریباً ایک سو سال پہلے ہوا ہے آنکھ سے دیکھنے کی حقیقت یہ ہے کہ نظر کسی شے کو بالراست نہیں دیکھتی بلکہ پہلے شے کا نور آنکھ تک پہنچتا ہے اگر غدر کا منظر سہیل کی طرف جانا شروع ہوا ہے تو سنہ ۱۸۵۷ء سے جا رہا ہے سنہ ۱۹۵۷ء میں یعنی کامل ایک سو سال بعد پہنچے گا۔ سہیل میں اگر لوگ ناظر ہیں تو ان کو ہندستان کا غدر اب سے یعنی (سنہ ۱۹۳۷ء) سے تقریباً ۲۰ سال بعد نظر آئے گا اس طرح وہی واقعہ جو ہمارے لیے ایک صدی کی حد تک ماضی ہو گیا سہیل والوں کے لیے تا حال مستقبل ہے۔ اکبر اس حقیقتِ اصلی کو یوں واضح فرماتے ہیں ؎

میرے دل سے امتیازِ دی و فردا اٹھ گیا — حشر بھی ماضی نظر آیا جو پردہ اٹھ گیا

اور اس سہولت کے ساتھ کہہ جاتے ہیں گویا ان مطالب کو ادا کرنا کوئی بات ہی نہیں ؎

حضرتِ منصور نا بھی کہہ رہے ہیں حق کے ساتھ　　دار تک تکلیف فرمائیں جب اتنا ہوش ہو

حضرت منصور کے پھانسی پانے کو جائز یا ناجائز قرار دینے پر دفتر کے دفتر لکھے گئے ہیں، مگر اس حقیقت کا اظہار اس پاکیزہ اسلوب کے ساتھ میری نظر سے فارسی اساتذہ کے کلام میں بھی کہیں نہیں گزرا۔

مغربی دھول کا سر تک نہ پہنچا تھا اثر　　ایک یہ بات بہت خوب کہی ہے

ہنسی ہنسی میں کیسی پتے کی بات کہی ہے۔ مشرقی وضع کے قیام کا یہ ایک ایسا فائدہ ہے جس پر اکبر ہی جیسے دوربیں کی نظر پہنچ سکتی تھی۔ کہتے ہیں کہ شدتِ موسم اور حربۂ دشمن سے حفاظت کے فوائد کے علاوہ عمامے کا جس کو ہم نے اپنی بدنصیبی سے ترک کر دیا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ اس سے قومی و شخصی وقار کی حفاظت ہوتی تھی۔ صاحب لوگ ہم پر ہاتھ ڈالتے ڈرتے تھے وضع کے ساتھ وقار اور رعب بھی جاتا رہا پھر فرماتے ہیں ؎

وضعِ مغرب سیکھ کر دیکھا تو یہ کافور تھی　　اب میں سمجھا واقعی داڑھی خدا کا نور تھی

داڑھی کا نور ہونے کے نتائج بھی دیکھنے کے قابل ہیں ؎

اگرچہ ریش منڈانے میں ہے صفائی رُخ　　گناہ گار مگر بال بال ہوتا ہے

ترکِ وضع پر خیال آیا۔ مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ایک دن دیوبند میں چند لوگوں کے ساتھ مسجد جا رہے تھے کہ یکایک ان کا بھانجا تانگے میں سامنے آگیا۔ داڑھی، مونچھیں صاف، پاجامے کی بجائے نیکر پہنے عمامے کی بجائے سر پر ہیٹ آگرہ کالج سے چھٹی میں گھر آرہا تھا کہ اچانک ماموں کا سامنے ہو گیا۔ حضرت ہاتھ پھیلا کر یہ کہتے ہوئے بڑھے "ارے تو آگیا" مجوب بھانجے کو چارہ نہ تھا اس حالت میں تانگے سے کود کر بغل گیر ہونے کو بڑھا اس کا ٹوپ حضرت کے ماتھے سے ٹکرایا اور گرنے لگا۔ وہ بغل گیر ہونے سے رُکا اس پر فرمایا مغربی

وضع کے ٹوپ ہیں اور خوبیاں ہوں گی لیکن ایک بڑا عیب یہ ہو کہ یہ دو خواہشمند
دلوں کو ایک دوسرے سے جی کھول کر ملنے نہیں دیتا۔ ہائے ؎
پنجۂ شیخ سے نکلے تو پریشان ہیں اب   ٹوٹی تسبیح کے دانے یہ مسلمان ہیں اب

معانی آفرینی | طوالتِ بیان کے خوف سے زیادہ تر اشعار کی صراحت نہیں کرتا صرف چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ دیکھیے کیا کیا معانی پیدا کیے ہیں اور کیسے نکتے بتلائے ہیں ؎

مرے عمل سے نہ شیخ خوش ہیں نہ بھائی خوش ہیں نہ باپ خوش ہیں
مگر سمجھتا ہوں اس کو اچھا دلیل یہ ہو کہ آپ خوش ہیں

صفِ مسجد میں جو آئے نظرِ عزت کر و اس کی   یہ سمجھو تم اسے اللہ کے دربار میں دیکھا

حسنِ بت یہ ہو تو اب یادِ خدا کی نہیں خیر   یہ ادا ہو تو نمازوں کی قضا آئی ہو

کسی کے مرنے سے یہ نہ سمجھو کہ جان واپس نہیں ملے گی
بعید شانِ کریم سے ہو کسی کو کچھ دے کے چھین لینا

بے دشمنِ جاں راحتِ دنیا ہو تو کیا ہو   قاتل ہو کوئی آنکھ تو جینے کا مزا ہو

خدا کا کام دیکھو بعد کیا ہو اور کیا پہلے   نظر آتا ہو مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے

اک ادا سے کہا مسوں نے "کمان"   تیر کی مجھ میں اب روانی ہو
Cameon

جو مانگنا ہو خدا ہی سے مانگ اے اکبر   یہی وہ در ہو کہ ذلت نہیں سوال کے بعد

جو مضطرب ہو اس کو ادھر التفات ہو   آخر خدا کے نام میں کوئی تو بات ہو

کانٹے بچھ جاتے ہیں ان لوگوں کی راہِ ذوق میں
خوف آتا ہے چھری چلتی ہے ان کی مسفر پر

تہذیبِ مغربی میں ہے بوسہ تلک معاف — اس سے اگر بڑھو تو شرارت کی بات ہے

اس بات کو جس کی عدمِ صراحت میں بلاغت ہے اکبر نے مغرب کے نقطۂ نظر سے گناہ یا جرم نہیں کہا صرف شرارت کہا ہے (You are very naughty) کہہ کر خراب کیے جانے کی شکایت ختم ہو جاتی ہے مشرق اسی حرکت پر اقبالِ خطا کرتا ہے ؎

بوسہ می خواہم ازاں رُخ تو چہ می فرمائی — گر صواب است بگو ورنہ خطا ے بکنم

(جامی)

لسانِ تیغ کبھی سرخ رُو یہ ہو نہ سکی — عجب نہیں کہ اسی سے تفنگ پر تف ہے

بہت کاٹنے والی اور گھسی ہوئی تلوار کی تعریف میں قاآنی کی معانی آفرینی بھی دیکھنے کے قابل ہے ؎

حکیمے گفت ہر کس خوں خورد لاغر شود اکنوں — یقینم شد کہ شمشیرش زخوں خوردن نزار آید

کہتا ہے کہ حکما کا قول سنا تھا کہ جو شخص خون پیتا ہے دُبلا ہو جاتا ہے اپنے ممدوح کی تلوار دیکھ کر مجھے اس قول کا اب یقین ہوا کہ یہ دشمنوں کا خون پیتے پیتے کیسی دُبلی ہو گئی ہے ؎

گُلِ تصویر کس خوبی سے گلشن میں لگایا ہے — مرے صیاد نے بلبل کو بھی اُلّو بنایا ہے
قدردانوں کی طبیعت کا عجب رنگ ہے کچھ — بلبلوں کو ہے یہ حسرت کہ وہ اُلّو نہ ہوئے
ناتوانی میری دیکھی تو مصوّر نے کہا — ڈر ہے تم بھی کہیں کھنچ آؤ نہ تصویر کے ساتھ
سایۂ مغرب سے شوقِ دل نے پھیلائے تو پاؤں — چار ہی دن میں مگر پتلون ڈھیلی ہو گئی

دامن سایہ پتلون دل پانو وغیرہ میں صنعت مراعات النظیر کی جو خوبیاں ہیں وہ ایک طرف اصل معانی و مطلب دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے کہ "جا اینجاست"

تشبیہ و استعارہ

کلام اکبر دیکھنے سے پہلے میں میر کے بیان کی خوبی اور تشبیہات کی ایسی ندرت کا قائل تھا ؎

دو شمعیں بھی جلائیے اب وقت فاتحہ
گوری کلائیاں سر مدفن اٹھائیے

اب حشر تک بہار تماشا ہے اور ہم
آنکھیں ہوتی ہیں بند رخ یار دیکھ کر

کل ہی کی وعدہ خلافی سے وہ محجوب نہیں
کئی شب کا ہے ہلال خم گردن ان کا

مگر ؎

کر دیا ایمان تازہ آپ کی رفتار نے
اس سے پہلے فتنۂ محشر کا میں قائل نہ تھا

اس میدان میں اکبر کے جوہر دیکھیے تو ان کی تلاش اور وسیع النظری نے آنکھیں کھول دیں کسی کا کمال فن جانچنے کے وقت صرف یہی نہیں دیکھا جاتا کہ کیا کہا ہے اس پر بھی سخت غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کس طرح کہا ہے۔ اکبر کا اسلوب بیان آسان سب کو نظر آیا مگر کام یاب مقلد کوئی نہ ہو سکا۔ ان کے طرز فغاں پر رشک سیکڑوں نے کیا مگر حقیقی نقل کسی سے بن نہ پڑی۔ انھوں نے اچھوتی ایجادات جدید مصطلحات نئے استعارات اور پاکیزہ تشبیہات سے زبان کو وسیع کیا اور آگے بڑھایا اور اپنے عہد پر پورا پورا اثر ڈالا۔ اسکر وائلڈ نے سچ کہا تھا "زمانہ شخصیت پیدا نہیں کرتا بلکہ شخصیت خود اپنے لیے زمانہ بنا لیتی ہے" ؎

لوگ کہتے ہیں بدلتا ہے زمانہ سب کو
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

دیکھیے کہ اکبر نے اچھی باتیں کہنے کی کن کن دل نشین تشبیہات کے ساتھ کیسے

کیسے اسلوب نکالے ہیں ؎

شادی کی کیا خوشی ہے غم کا بھی رنج کیا ہے ۔۔۔ وہ بھی گئی ایک بجلی اور یہ بھی اک ہوا ہے

کسی ایرانی کا شعر ہے ؎

نہ شادی داد سامانے نہ غم آورد نقصانے ۔۔۔ بہ پیشِ ہمتِ ما ہر کہ آمد بود مہمانے

مرے سازِ سخن پر پست فطرت کو تنفّر ہے ۔۔۔ پپیا نوبے سُرا سمجھا گیا بزمِ شغالاں میں

مواقع دیکھ کر اظہارِ مردی چاہیے اے دل ۔۔۔ ڈرائیں کھیل میں بچے تو ڈر جانا ہی بہتر ہے

ایک ایرانی نے بھی اسی خیال کو ادا کیا ہے کہ اگر بوڑھا باپ بچے کے ساتھ کھیلنے میں بچے کی سی توتلی زبان استعمال کرے تو یہ اس کی نادانی پر محمول نہ کرو۔ ع

عاقل داند کہ آں پدر کودک نیست

قوم ضعیف تنگ ہے چندوں کی مانگ سے ۔۔۔ کالج کے چھوٹے لپٹے ہیں لڑکی کی ٹانگ سے

نہ قوم کی تمھیں الفت نہ قوم کا ہے وجود ۔۔۔ فقط یہ پولیٹکل ایجی ٹیشن کا ہے مقصود

چھاونی میں رہیں صاحب تو ہیں لیڈر بھی ۔۔۔ یعنی کیوں ساتھ سلیمان کے ہدہد نہ رہے

ہزار دور ہوں لیکن جو ہیں وہ اپنے ہیں ۔۔۔ کسی کی آنکھ سے ہوتی نہیں نگاہ جدا

رزولیوشن کی شورش ہے مگر اس کا اثر غائب ۔۔۔ پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا

مولوی گو کہ ہیں شمس العلما پھر بھی ہیں سست ۔۔۔ رینگتے پھرتے ہیں پروانۂ بے شب کی طرح

بھروسا باغِ ہستی میں نہیں کچھ نخلِ قامت کا ۔۔۔ نفس کیا ہے ہوا کی بیل ہے دھوکے کی ٹٹی ہے

چال دنیا کی تمھیں محسوس ہو دشوار ہے ۔۔۔ یہ زمیں چلتی ہے تیزی سے مگر ہلتی نہیں

بوسے وفا نہیں ہیں ہوسوں کے اصول ہیں — بس رنگ دیکھ لیجیے گملے کے پھول ہیں

ہیں لگا ہو ہر طرف ہر گز مگر کوئی نہیں — زنبیر ہم لے رہے ہیں اور گھر کوئی نہیں

بتوں سے میل خدا پر نظر یہ خوب کہی — شب گناہ و نماز سحر یہ خوب کہی

مضمون وہی پرانا ہے کہ ؎

جو بھی ہوٹل میں ہو چندہ بھی دو مسجد میں — شیخ بھی خوش رہیں شیطان بھی ناراض نہ ہو

شیخ سے چھیڑ

یا دش بخیر شیخ کے تذکرے نے اس طبقے کی نسبت اکبر کے دوسرے خیالات تازہ کر دیے - یوں تو کون ایسا ہی شاعر ایسا ہے جس نے اپنی نوکِ قلم سے ان لوگوں کو کچوکے نہیں دیے ہیں لیکن اکبر نے ان کی جتنی کمزوریاں تشت از بام کی ہیں اور جیسے جیسے دل کے چور پکڑے ہیں وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوئے - علامہ مشرقی اور علامہ نیاز نے اس گروہ کے نقاب اٹھ جانے کے بعد کے حقائق کچھ کم کوشش سے نہیں دکھائے مگر نتیجہ کیا نکلا تلخیِ گفتار سے دشمنی بڑھ گئی اور بقولِ اکبر ڈھٹائی کے ساتھ ؏

نقاب الٹ ہی دی اُس نے یہ کہ کر کہ کر ہی لے گا مرا مُوا کیا

اکبر نے بھی ان کا ایک ایک عیب چُن کر بتایا ہے مگر ایسی زندہ دلی اور بذلہ سنجی کے ساتھ کہ ان کو زندگی بھر اپنے خلاف جہاد کرنے کا موقع نہ دیا. فرماتے ہیں کہ شیخ لکیر کے فقیر ہیں اور حالات کے لحاظ سے اپنے علم کو بڑھانے اور تبلیغی سعی کرنے سے بالکل قاصر ؎

شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ — گھر میں بیٹھے ہوئے والتین پڑھا کرتے ہیں

شبلی مرحوم نے بھی شیخ صاحب کی یہی دُکھتی ہوئی رگ پکڑی تھی جس پر برہم ہو گئے تھے ؎

بولے کہ خبردار یہ کیا سوئے ادب ہے — کہتے ہو وہ باتیں جو سزاوار نہیں ہیں

کرتے ہیں شب و روز مسلمانوں کی تکفیر بیٹھے ہوئے کچھ ہم بھی تو بیکار نہیں ہیں

شیخ صاحب نے متواتر دیکھا کہ بیمار کے سرہانے آخر وقت یٰسین شریف پڑھی جاتی ہے تو اس کا دم جلد نکل جاتا ہے اس سے نتیجہ یہ نکالا کہ یٰسین ایک دم گھوٹنے والا گیس ہے جب یٰسین کا اثر انسان کو جلد ختم کر دینے کا مرادف ہے تو اس کے ورد سے بیٹھے بٹھائے اپنی جان عزیز کو خطرے میں کون ڈالے نہ بانس ہوگا نہ بانسری بجے گی ؎

شیخ ڈرتے ہیں کہیں دم نہ نکل جائے مرا انس اس واسطے رکھتے نہیں یٰسین کے ساتھ

ہمارے اکثر قدیم خیال بزرگوں کو عالیہ حقائق اور تجرباتی علوم کی ہوا نہیں لگی مگر ان کا منہ ہے کہ جس حقیقت کے خلاف چاہیے کھلوا لیجیے۔ ایک مولوی صاحب مصر تھے کہ جغرافیہ کو نصاب تعلیم سے خارج کر دینا چاہیے اس سے کیا فائدہ ہے کہ جھیل سانبھر راج پوتانے میں ہے اور مانسرور تبت میں۔ ایک دوسرے بزرگ کو اس مسئلے پر ضد کرتے دیکھا کہ سیاروں کے فاصلے کا تعین ایک یورپین گپ ہے۔ خود جو کہ واقف نہیں اعلیٰ ریاضی ان کے نزدیک کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی۔ ان لوگوں کو اعتراف جہل کرتے ہوئے شرم آتی ہے اور اپنی عدم واقفیت کے باعث بہت سی غلطیاں کر جاتے ہیں۔ دیکھیے اکبر نے اس کا کیسا لطیف نوٹ لیا ہے ؎

ناتجربہ کاری سے واعظ کی ہیں یہ باتیں اس رنگ کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہے

غالب کے نصاب تعلیم میں سبق الاشیا کا مضمون داخل نہ تھا وہ اس حقیقت سے ناواقف تھے کہ سؤر کے پنجے ہوتے ہیں یا کھر اس وجہ سے اپنی ایک مثنوی میں دشمن کی نسبت کہہ گئے ع

خوک شد و پنجہ زدن باز کرد

جب اہل کلکتہ نے اعتراض کیا کہ "مرزا خوک پنجہ ندارد" تم نے کبھی سؤر

دیکھا بھی ہے؟ تو ذہین شخص نے یہ جواب دے کر خجالت مٹائی بھائی! میں بوڑھا ہو گیا،
میں نے تو اس نجس جانور سے اب تک حرفی عملی نہیں کی جس کو ضرورت ہو
اس سے تعارف بڑھائے۔ مگر معترض کا اعتراض اپنی جگہ پر قائم رہا کہ "ناتجربہ کاری
سے غالب کی ہیں یہ باتیں"! اکبر اعظم کے دربار میں عبدالغنی صدرالصدور نے قاسم
کوہی کو اس کی اس رباعی پر یہ کہہ کر سخت پکڑا کہ "اہانت دین است" ؎

ہر کس کہ ز اسرار خدا آگاہ ہست　　　پیوستہ میاں بنگیانش راہ ہست
از بنگ شود سیر انالحق ظاہر　　　چوں ہر برگش بہ صورت اللہ ہست

قاسم نے اکبر سے بقولِ اکبر الہ آبادی یہی کہا کہ حضور صدرالصدور صاحب سے
بھنگ کے بارے میں "پوچھو تو کبھی پی ہے" صدرالصدور کو اکبر کے اصرار پر کہ
جواب دو، کہنا پڑا کہ استغفراللہ پینا کیسا میں نے کبھی بھنگ کی پتی کی شکل بھی نہیں
دیکھی ہے اور قاسم کوہی کا اعتراض حسبِ حال بحال رہا کہ ع

ناتجربہ کاری سے واعظ کی ہیں یہ باتیں

شیخ صاحب کو اس پر غرہ ہے کہ ہم بت شکن ہیں اور خدا کے سامنے سر کو زمین پر
رکھنے والے حالانکہ سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ ع

آں را بہ زمیں بنہ کہ در سر داری

سبب اُن کا تو ہے ظاہر خدا لب ہر خودی دل میں
بتانِ سنگ دل ٹوٹے بت پندار باقی ہے

"چاہ زمزم کے مینڈک" کی بھی یہی حالت ہے ؎

غوطے تو لگائے زمزم میں اور غرق ہیں حبِّ دنیا میں
پانی سے بدن کو پاک کیا اب جان کو طاہر کون کرے

عرفان کم گوئی، کم خوابی اور کم خوری سے حاصل ہوتا ہے لیکن جن مشائخین

کی خوراک ڈھائی سیر ہوا وہ اپنے کھانے کو دیکھیں دوسروں کے پینے کو دیکھنے کا انھیں کیا حق ہے ؎

زندگی سے میرا ہوائی سیر ہے — پھر بھی خوراک اس کی ڈھائی سیر ہے
مجھ کو نوش کرنی ہے تی شیخ جی کو فرہی — ہیں ہوں پینے کے لیے اور وہ ہیں کھانے کے لیے

حلوائے سقنقور، از دیاد قوت ۔ ۔ ۔ کے لیے ہوس پیشہ امرا کی خاص غذا ہے۔ شیخ صاحب بھی اس کا خاص شوق رکھتے ہیں اس لیے کہ لذت کے علاوہ یہ کمر کو طاقت بخشتی ہے ؎

شیخ صاحب کی کمر جھک گئی پر دل نہ جھکا — آج تک شوق سقنقور چلا جاتا ہے

شیخ کے گڑ کھانے اور گلگلوں سے پرہیز کا یہ عالم ہے ؎

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں — مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

شیخ صاحب مذہب پر صرف اس وقت تک عامل ہیں جب تک پیٹ کا دھندا اچھا چلتا ہے ؎

خوشی سے شیخ کالج سوئے مسجد اب نہیں جاتا
جہاں روٹی نہیں چلتی وہاں مذہب نہیں چلتا

کالج سے نکل کر شیخ صاحب کو فوج میں نوکری مل جاتی ہے تو ایسی مکروہ غربات انجام دیتے ہیں ؎

برگیڈ کے مولوی کو تم جانتے ہو کیا ہے — انگلش کی پالسی کا عربی میں ترجمہ ہے

موجودہ تعلیم پر نکتہ چینی

آج کل حاملانِ عقل و رائے کو متواتر تجربوں نے اس نتیجے پر پہنچایا ہے کہ ملک کی نامرادی کا حقیقی سبب حالیہ تعلیم کا نقص ہے۔ جو مشاغل صاحبانِ دولت و ملک کے لیے زیبا ہیں وہ ناداروں کی زندگی کا جز بن گئے ہیں۔ یہ مروجہ تعلیم ہی کی خرابی کا باعث

ہو کہ رئیس تو رئیس ہر غریب آدمی اُس ریس کو اختیار کر رہا ہو جو اس کی حیثیت سے اونچی اور اس سے بجھنے والی نہیں۔ غیر مالکانِ مال و جمال ہیں اور ہم فاقہ مستیوں کی مثال۔ ہمارا عسرت زدہ گھر تخریب کا نمونہ ہو اور ہمارا دل مغربی تہذیب کا دیوانہ۔ ہماری مشرقی معیشت کا یہ حال کہ ؎

کونے کونے ہیں گھر کے جالے ہیں — اور ہم سوٹ کے حوالے ہیں

ہماری حیات وحرم کی مَلِکہ آج مشاغلِ کلب میں مصروف ہو۔ وہی جو کل ملکِ دل کی شہزادی تھی آج کنیز آزادی ہو ؎

انقلاب دہر نے بیگم کو آیا کر دیا — خود پری تھی اس پہ اب پریوں کا سایہ کر دیا

ہم کو دعوتیں کھانے کا شوق ہو فاقہ زدہ اقربا کا غم کھانا ہم نے بالکل چھوڑ دیا۔ خیالِ سعی ومحنت کو گھٹا کر ہم نے شان وعزت کے احساس کو بڑھا لیا۔ ہم تقریبوں اور مشاعروں کی واہ کو دیکھتے ہیں غم زدہ خاندانوں کی آہ کو نہیں دیکھتے۔ مدرسے میں ہم نے نازآفرینی کا ایک ایکٹ کر لیا تو سمجھ لیا کہ شخصی اور قومی فلاکت کا داغ مٹ گیا غرض کہ ؎

ہر طرح قوم ہو چکی بدنام — اب نہ مایہ ہو پاس اور نہ رام
بس نئے دھائی اور دھاتے ہیں — ہم نہ گھر کے ہیں اب گھاٹے ہیں
لوگ اچھے عمل پہ مرتے ہیں — آپ ٹاکی کی ٹاک کرتے ہیں
ہو پدر مرغِ بسمل دبے پر — آپ کے ہاتھوں اڑ رہا ہو زر
آپ پر ٹھی ہو ان کی خدمت فرض — ہو بڑھا یا جنھوں نے لے کر قرض
گھر میں کون آ کے اب بٹائے ہاتھ — آپ جاتے ہیں اہلِ پیچ کے ساتھ
آپ نے اوڑھ لی تن آسانی — کون دے ماں کو اک گھڑا پانی
چھپ کے بیٹھا ہو قرض خواہ سے باپ — جا رہے ہیں متن کے چرچ میں آپ

بچے سب بھوک سے دبولے ہوں — آپ ہوں اور چائے خانے ہوں
یادِ ترکِ عمل کی گھاتیں ہیں — قال تک ہسٹری کی باتیں ہیں
ہے یہ تقریر مدرسہ کا اثر — تختۂ مشق ہے وقارِ پدر
ماں پہ چلتی ہے یوں زباں فرفر — جس طرح رُخ پہ سیفٹی ریزر (قمر)

ہمارے جدّ مجاہد تھے اور باپ غازی۔ ہم کو اور ہماری اولاد کو دیکھیے تو دیرینہ بے نمازی۔ ہماری نوکِ زباں پر برج (تاش کا جوا) کے قواعد ہیں اور یہ حساب کہ کون کتنا جیتا۔ اب نہ پیشِ نظر احکامِ قرآن و گیتا ہیں نہ اخلاق رابعہ بصری و سیتا۔ ہم پیچ کی کام یابی و نام یابی جانتے ہیں، دیو نفس پروار کرنا بالکل فراموش کر چکے ہیں۔ طعن و ذلّت کا اندیشہ نہ صنعت سیکھنے دیتا ہے نہ پیشہ۔ شوقِ عسکریت کی جگہ نازِ نسائیت نے لے لی۔ جو انگلیاں تیغ کی دھار دیکھتی تھیں وہ اب وقفِ ستار ہیں۔ شوقِ غلامی اب تمام دفاتر کے آستانوں کی سلامی کراتا ہے۔ ہم جو کچھ سیکھتے ہیں وہ محض کتب و قال سے نہ کہ صاحبانِ کیف و حال سے۔ اکبر نے تعلیم کی اس خرابی پر آنسو بہائے ہیں کہ

لفظ تو لفظ ہی سکھاتے ہیں — آدمی آدمی بناتے ہیں

افسوس سے

سیکھتے ہیں ہم آج بات کچھ اور — اور ہے مقصدِ حیات کچھ اور (قمر)

(۱) روشن خیال طبقہ تعلیم کی جن خرابیوں کا آج اظہار کر رہا ہے دیکھیے اکبر نے آج سے نصف صدی پہلے ان کے خلاف کیسا آوازہ مخالفت بلند کیا ہے۔ اکبر کا یقین ہے کہ حالیہ تعلیم ہم کو وہ ڈھب نہیں سکھاتی جس سے زندگی کام یابی کے ساتھ گزاری جا سکے۔ فرانس کا مشہور قائد اور ادیب روسو کہا کرتا تھا کہ ارسطو کے تمام فلسفیانہ اور اصولی ذخائر کے مقابلے میں مجھے ڈنیل ڈی فو کے وہ عملی تجربات زیادہ

گراں قدر معلوم ہوتے ہیں جو اس نے الگزنڈر سلکرک کے پردے میں دنیا کو سکھائے ہیں۔ اکبر بھی یہی کہتے ہیں کہ دنیا کو خیالی شیخ چلیوں کی ضرورت نہیں، اس کو اب باعمل شہری درکار ہیں ؎

شیخ صاحب کو ہے بڑا دعوئے
اونٹ کے سو لغات جانتے ہیں

ہیں مگر اونٹ پر نہیں قابض
کام کی ہم یہ بات جانتے ہیں

(۲) فرماتے ہیں کہ میکالے جیسے اشخاص نے موجودہ تعلیم کی داغ بیل کبھی اس خیال سے ڈالی تھی کہ ہم کلرک بنیں اور کمپنی کو سستے عمال اور مرغ آمیں ملازم ہمدست ہوسکیں۔ یہ اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ ہم ناکارہ خود پسند بے ادب لامذہب بداخلاق اور کاہل ہو گئے ہیں ؎

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے نری بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

(۳) دو محرک بچے کی زندگی پر خاص طور پر موثر ہوتے ہیں ایک ماں کا دودھ جو ارثی اثرات ڈالے بغیر نہیں رہتا، دوسرے ابتدائی تعلیم جو افتادِ مزاج مرتب کرتی ہے۔ مغرب نے ہم کو بگاڑنے کے واسطے پہلے ان دو محرکات کو اپنے بس کا کر لیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اقوام کو بگاڑنے کے یہی اسباب ہیں۔ روما کے زوال کے سلسلے میں تاریخ کا یہی اعلان ہے کہ "زمانۂ عروج روما میں پیدائش سے چھ سال تک بچوں کی معلمہ ان کی ماں ہی ہوا کرتی تھی۔ یہی اپنا دودھ پلا کر بچوں کے اندر زبان، خیالات اور اخلاق کی بنیاد ڈالتی تھی" بعد کو جب سلطنتِ روما و یونان میں گھن لگا تو اس خرابی کا ایک بڑا سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ابتدائی پرورش اور تربیتِ اطفال کا کام راحت دیدہ اور نعمت کشیدہ ماؤں نے بالکل چھوڑ دیا۔ بچے پیدا ہوتے ہی

رذیل دودھ پلانے والی اناؤں اور معلمات کے حوالے کر دیے جاتے تھے اس سے رومیوں کی نئی نسل کی عمارتِ اخلاق ٹیڑھی ہی رہی اور بالآخر منہدم ہو گئی، بقولِ مولانا رومؔ ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج　　تا ثریا می رسد دیوار کج

مشہور یونانی رہبر کیٹو نے اپنے لڑکے کے خط میں لکھا تھا "میرے کہنے کو ارشادِ پیغمبری سمجھ کر اس پر ایمان لاؤ اور یقین جانو کہ یونانی ناقابلِ اصلاح حد تک ناکارہ ہو گئے ہیں۔ اگر ان کی راحت پسندی اور بانکپن نے ہم میں گھر کر لیا تو سمجھ لو کہ ہماری قوم کی قسمت پھوٹ گئی" اکبر مرحوم نے ان سب باتوں پر کامل غور کرنے کے بعد ایسا حکیمانہ مطلع کہا ہے ؎

طفل میں بو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی
دودھ تو ڈبے کا ہے تعلیم ہے سرکار کی

اسی لیے لڑکوں کو مشورہ دیتے ہیں ؎

کالج میں بگڑ جاؤ گے وسواس یہی ہے　　تم پاس رہو میرے بڑا پاس یہی ہے

(۴) درسگاہوں میں جو کتب پڑھائی جاتی ہیں اُن میں "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" کے مسئلے کو ضرور ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان بچہ سیوا جی کو ایک سفاک لٹیرا سمجھتا ہے اور ہر ہندو طالب علم یقین رکھتا ہے۔ ع

کہ عالمگیر ہندو کش تھا ظالم تھا ستمگر تھا

یہی وجہ ہے کہ اس ملک کے فرقہ وارانہ نزاعات کبھی ختم نہیں ہوتے۔ اس حقیقت پر نظر کرنے والے بہت کم ہیں کہ مغرب کے تعلیمی انجکشن نے ہندو مسلمان دونوں کی حالت بالکل بدل دی ہے اب نہ ہندو ہندو رہا، نہ مسلمان مسلمان۔ اس پر اکبر کا تبصرہ دیکھیے ؎

پنڈت نے خوب بات کہی جوشِ طبع میں ناحق قدیم عہد پہ یوں طعنہ زن ہیں آپ
پتھر کے بت یہ اب تو دھرم ٹوٹنے لگے محمود بت شکن تھا برہمن شکن ہیں آپ

اکبر کی ذہانت دیکھیے کہ خود خواہ کیسے ہی عاملِ شرع اور واقفِ تفسیر ہوں۔ یہاں چونکہ ہندو دھرم کا معاملہ تھا حق بات پنڈت کے منہ سے کہلوائی وہ بھی جوشِ طبع میں ع

جو سنتا ہے وہ کہتا ہے کہ کہنا اس کو کہتے ہیں

(۵) فرماتے ہیں موجودہ تعلیم نے ذہنوں کو جلا دے دی ہے مگر لطیف جذبات کو بالکل ماند کر دیا۔ عقلیں تیز ہو گئی ہیں تو ایمان ضعیف۔ ظاہر بہ سر فروغ ہے تو باطن مردہ، ذاتی خود غرضی نے ملّی مصلحت و عزّت کو بالکل مٹا دیا ؂

نئی تعلیم میں تقوے کا وہ اکرام کہاں نازِ بے حد ہے مگر غیرتِ اسلام کہاں

(۶) مذہب ایک اعتقادی شے ہے روایتی نہیں اس کا تعلق ذوقِ سلیم سے ہے حجت و فلسفے سے نہیں۔ آج کل کی تعلیم نے اسی نکتہ کو فراموش کر دیا ہے۔ مذہب خدا کا علم بچّے کے دماغ میں کانوں کے ذریعے پہنچتا ہے آنکھوں کے ذریعے نہیں۔ اسی لیے دینیات و اخلاق سکھانے کے واسطے اربابِ تعلیمات نے مستقل کتابیں داخلِ نصاب کی ہیں۔ اوراقِ فطرت کھولنے کے بجائے طلبہ کے سامنے درسی کتبِ اخلاق کے صفحات پیش کیے جاتے ہیں حالانکہ نظرِ انصاف سے دیکھیے تو ؂

ہسٹری کی کیا ضرورت دین کی تعلیم کو انجم و شمس و قمر کافی تھے ابراہیم کو

(۷) مضامینِ نصاب کی اہمیت اور عدمِ اہمیت ضرورتِ زمانہ کے لحاظ سے ہر عہد میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہے کبھی کوئی مضمون غیر ضروری سمجھا جاتا تھا کبھی کوئی، کبھی کسی کو ترک کیا جاتا تھا کبھی کسی کا اضافہ کیا جاتا تھا۔ کسی زمانے میں کسی مضمون

نصاب پر زیادہ زور دیا جاتا تھا کسی عہد میں کسی پر۔ آج کل اَخلاق و مذہب کو جو انسانیت کی جان ہے بالکل پس پشت ڈال دیا ہے۔ اس کے لیے ہفتے کے ۴۲ گھنٹوں میں سے صرف دو گھنٹے فی ہفتہ دیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نصاب کے اس نقار خانے میں اس طوطیٔ اَخلاق کی آواز کیا سنائی دے۔ دیکھیے اکبر نے اس اعتراض کو کس نادر تشبیہ کے ساتھ پیش کیا ہے فرماتے ہیں ؎

نئی تعلیم میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے　　　مگر ایسی کہ جیسے آبِ زمزم مَے میں داخل ہے

(۸) مغربی تعلیم کا جتنا اثر ممالکِ مشرق میں بڑھتا جاتا ہے، باہمی خلوص و ایثار آپس کا اُنس اور پیار گھٹتا جاتا ہے۔ اس اثر نے ممالکِ مشرق کی روایتی محبّت بالکل رخصت کر دی۔ خدمت و رافت کی جگہ حسد و نفاق نے لے لی ہے۔ یہ مضر اثرات ہندستان سے لے کر عرب تک روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں ؎

نجد میں بھی مغربی تعلیم جاری ہو گئی　　　لیلیٰ و مجنوں میں آخر فوجداری ہو گئی

(۹) دانایانِ فرنگ نے اہلِ مشرق کے دل میں یہ بات پورے طور پر اتار دی ہے کہ فارسی، سنسکرت، یا عربی وغیرہ قدیم اور از کار رفتہ زبانیں ہیں اور دنیا میں اجرائی ضرورت کے لیے بالکل بے کار۔ اس لیے بہتر ہے کہ ترقی خواہ قوم عربی کی بجائے انگریزی پر توجہ کرے کیونکہ یہ ایک زندہ اور موثّر زبان ہے ؎

شیطان عربی سے ہے ہند میں بے خوف　　　لاحول کا ترجمہ کرے انگریزی میں

اس مغربی اغوا کے باعث مسلمانوں نے عربی کی جانب توجہ کرنا بالکل چھوڑ دی اور ظاہر ہے کہ عربی کا چھوڑنا اپنے قومی شعار اور دینی کردار کو بالکل ملیا میٹ کر دیتا ہے ؎

مسلمانوں کا وہ آئینِ طبع مستقل بدلا　　　گئی عربی چھٹا قرآں زباں بدلی تو دل بدلا

(۱۰) علم ایک قوت ہے۔ اہلِ مغرب نے اس کو ہمارے خلاف اس دانائی سے

استعمال کیا ہے کہ ہم کو ہمارا نقصان اب تک نہیں معلوم۔ ہم حاکم سے محکوم اور آزاد سے غلام ہو گئے لیکن اس پر خوش ہیں ؎

گو لاکھ بے وقار ہوں بدّھو کو غم نہیں کافی ہے یہ شرف کہ وفا میں کم نہیں

اب یہ احساس ہماری روح میں سرایت کر گیا کہ ہم بنے ہی اہلِ مغرب کی اطاعت کے لیے ہیں ایک حاکم نہ سہی دوسرا سہی۔ ع

ہمارا کام ہے اس کو سلام کر لینا

اس منتشرہ پست اور ذلیل ذہنیت پر خوش رہنا ہمارا شیوہ ہو گیا ہے۔ اکبر اسی پر روتے ہیں ؎

مٹاتے ہیں جو وہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں مجھے حیرت تو اُن پر ہے جو اس مٹنے پہ مرتے ہیں

پھر فرماتے ہیں ؎

صیاد ہنر سکھلائے اگر تعلیم سے سب کچھ ممکن ہے
بلبل کے لیے کیا مشکل ہے اُلّو بھی بنے اور خوش بھی رہے

(۱۱) موجودہ تعلیم نے پوری قوم کے مذاق اور تخیّل کو بدل دیا۔ آج کل ع

فکر روزی ہو رہی ہے فخرِ رازی اب کہاں

اب تو گٹ پٹ کر لیا اور چل دیے اسکول کو جن سے مسجد گونجتی تھی وہ نمازی اب کہاں

اسی لیے اکبر طنز کے طور پر کہتے ہیں ؎

جب یہ حالت ہے تو ذکر مسجد و مکتب فضول کہ دو لڑکے سے خریدے پیڈر اور اسکول جائے

اس تباہ حالی کے باوجود اکبر مایوس نہیں ہیں۔ اصلاحِ حال کا نسخہ تجویز کرتے ہیں ؎

مسجد میں خدا خدا کیے جاؤ مایوس نہ ہو دعا کیے جاؤ
ہرگز نہ قضا کرو نمازیں مرتے مرتے ادا کیے جاؤ

(۱۲) اکبر کا خیال ہے کہ موجودہ عہد میں لوگوں میں جو نمائش پسندی، فیشن،

بے عملی اور بداخلاقی پائی جاتی ہے وہ سراسر نقصِ تعلیم کے باعث ہے۔ خدا جب سزا دینے لگے گا تو مغرب زدہ نوجوان یہی جواب دیں گے کہ پروردگار اس میں ہماری خطا نہیں ہمارے طریقۂ تعلیم کا قصور ہے ؎

مسٹر نقلی کو عقبیٰ میں سزا کیسی ملی ۔۔۔ شرح اس کی نامناسب ہے ملی جیسی ملی
اس نے بھی لیکن ادب سے کر دیا یہ التماس ۔۔۔ چارہ ہی کیا تھا خدا تعلیم ہی ایسی ملی

(۱۳) اکبر کے بارے میں یہ تصور قائم کر لینا کہ وہ ہر مسئلے میں قدامت پسند ہیں درست نہیں بعض تعلیمی مسائل میں ان کے خیالات انیسویں اور بیسویں صدی کے مخصوص جدید خیال مصلحین تعلیم سے ملتے ہیں۔ مثلاً طلبہ کو جسمانی سزا دیے جانے کے معاملے میں وہ فروبل اور میڈم مانٹی سوری کے بالکل ہم خیال ہیں۔ وہ اس اصول کے بالکل مخالف ہیں کہ Spair the rod and Spoil the child یا یہ کہ ؎

آسانیٔ زیست وہ کیا جانے جس پر دنیا کڑی نہ پڑی
اس طفل کو علم سے کیا مطلب جس پر مکتب میں چھڑی نہ پڑی

وہ یقین رکھتے ہیں کہ ؎

درسِ ادیب اگر بود زمزمۂ محبتے ۔۔۔ جمعہ بمکتب آورد طفلِ گریز پائے را

اس لیے کہتے ہیں کہ "اُستاد اُستاد ہو تو ہو مگر اُستادجی نہ ہو" مدرس کا کام شفقت سے پڑھانا ہے، طلبہ اڑانا یا چھڑی اڑانا نہیں۔ میڈم مانٹی سوری کا نظریہ ہے کہ استاد فکر و محبت سے تعلیم دے زدو کوب جیسے مضر و مذموم ذریعے کا تو خیال ہی نہ کرے۔ اکبر بھی یہی کہتے ہیں کہ جسمانی سزا بچے کے حق میں مفید ہونے کے بجائے مضر ہوتی ہے اس لیے اساتذہ سے اپیل کرتے ہیں کہ بچوں کو جسمانی سزا دینے سے حذر کریں ؎

یہ اتنی گوشمالی طفلِ مکتب کی نہیں اچھی　　زبان تو بے شک آتی ہے و لیکن کان جاتا ہے

(۱۴) تعلیم نسواں کے متعلق اکبر کا خیال ہے کہ عورت گھر کے لیے بنی ہے دفتر کے لیے نہیں۔ وہ باپ یا شوہر کی مشیر ہے، سماج کی جاگیر نہیں۔ مغرب خود عورتوں کو اپنے یہاں زیادہ تعلیم اور آزادی دے کر تنگ ہے۔ ہندستان میں عورتوں کو اعلیٰ تعلیم کی کسی طرح حاجت نہیں جو عورتیں اعلیٰ تعلیم پاتی ہیں وہ اپنی کمزوریٔ صحت، غیر واجبی احساسِ عزت، تبدیلیٔ معاشرت، کمیٔ محبت، نمایش پسندی کی عادت اور بے حجابیٔ فطرت کے باعث شوہر کے گھر کو گوشۂ سکون و مسرت بہت کم بنا سکتی ہیں۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اعلیٰ تعلیم کا طویل سلسلہ طبقۂ اناث میں آزادی بد نظری اور بد اخلاقی نہ بڑھائے۔ اکبر نے انھی خیالات کو حسبِ ذیل اشعار میں ظاہر کیا ہے۔

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر　　خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی　　اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

قومی ترقیوں کی زمانے میں دھوم ہے　　مردانے سے زیادہ زنانے میں دھوم ہے

دولھا بھائی کی ہے یہ رائے نہایت عمدہ　　ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید
خود تو کٹ پٹ کے لیے جان دیے دیتے ہیں　　ہم سے کہتے ہیں کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر　　شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

اُن سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی　　یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

اپنی اسکولی بہو پر ناز ہے ان کو بہت　　بال میں ناچے کسی دن اُن کی پوتی تو سہی
اپنی دیں میں آبرو کی کچھ نہیں پروا انھیں　　نذرِ بھونِ ترقی ہو یہ موتی تو سہی

گھر سے جب پڑھ لکھ کے نکلیں گی کنواری لڑکیاں ۔ باہنر با علم و خوش رُو ساختہ پرداختہ
مغربی تہذیب آگے بڑھ کے جو حالت دکھائے ۔ نوجواں دکھلائی دیں گے ہر طرف دل باختہ
ڈال دے گا سینۂ غیرت سپر میدان میں ۔ تیغ ابرو ہی نظر آئے گی ہر سو باختہ

میں بھی گریجویٹ ہوں تو بھی گریجویٹ ۔ علمی مباحثے میں ذرا پاس آکے لیٹ
دونوں نے پاس کر لیے ہیں سخت امتحاں ۔ ممکن نہیں کہ ہم سے ہو اب کوئی بدگماں
بولی یہ سچ ہے علم بڑا جہل گھٹ گیا ۔ لیکن یہ کیا خبر ہے کہ شیطان ہٹ گیا

کمرے میں جو ہنستی ہوئی آئی مس رعنا ۔ ٹیچر نے کہا علم کی آفت ہے تو یہ ہے

نقائص کلام

اسکرو ائلڈ کے بقول کلام موزوں بالقصد کو شعر کہتے ہیں اور کلام بالقصد متاثر ہوتا ہے شاعر کی حیات کے مدارج سے کسی شخص کی پرائیویٹ زندگی میں کوئی نقص نظر آتا ہے تو معترض کو یہ کہہ کر روکا جاسکتا ہے کہ ذاتیات سے بحث کی ضرورت نہیں لیکن اگر انسان شاعر یا لیڈر واقع ہوا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خانگی زندگی سے نکل کر پبلک میں آگیا اس کو اگر مقرر یا شاعر ہونے کی حیثیت سے پبلک کے نقائص ظاہر کرنے کا حق ہے تو پبلک کو بھی استحقاق پیدا ہوجاتا ہے کہ اس کی خانگی زندگی سے مختلف مدارج کا تجسس کرے اور اس پر کھل کر نکتہ چینی کی جائے ۔ مولوی عزیز مرزا صاحب نے اسی لیے کہا تھا کہ اکبر کہتے تو بہت کچھ ہیں دیکھنا یہ ہے کہ کرتے کیا ہیں۔ اس طرح اکبر پر بڑا اعتراض جو کیا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ اُن کے اشعار و اعمال ہم آہنگ نہ تھے ۔ اس پر اعتراض سے پہلے اس حقیقت پر بھی غور کی ضرورت ہے کہ انسان ایک بدلتی رہنے والی مخلوق ہے فیلِ حیات کے صرف ایک حصّۂ جسم یعنی محض کان ، یا تو یا سونڈ کو ٹٹول کر دعویٰ کر بیٹھنا کہ ہاتھی چپٹا ہے ، گول ہے یا گاؤدم

درست نہیں ہے۔ اگر کوئی شاعر واقعی مفکر ہے تو اس کے خیال و عمل کے تنوع کے بلحاظ اس کی جانب سے سطحی طور پر کچھ متضاد اقوال و اعمال کا ظاہر ہونا ایک لازمی امر ہے۔ شاعر حقائقِ حیات پیش کرتا ہے اور نفوسِ قدسیہ کو چھوڑ کر، سازِ زندگی خود ایک تضاد ہے کہ طفلی جوانی اور پیری کے سُر کسی صورت پورے طور پر ہم آہنگ ہوتے ہی نہیں۔ جو لوگ ظرف گلی کی بھونڈی ساخت پر ہنستے ہیں ان کا خندہ فی نفسہٖ کمہار پر ہوتا ہے اور تضاد کا اعتراض مصنوع سے ہٹ کر صانع کی طرف واقع ہو جاتا ہے ؎

آئیں نہ جوڑ توڑ طبیعت میں کس طرح تعمیرِ جسم ہی نہ ہوئی سادگی کے ساتھ

(نولاؔ بدایونی)

اس طرح قول و فعل کے تضاد کا اعتراض میرے خیال میں چنداں قابلِ خیال نہ ہونا چاہیے اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی تنقید کی صداقت سے بعید ہے کہ کوئی ناقد کسی صاحبِ کمال کے معیار سے گرے ہوئے حصۂ کلام کو اپنی قوتِ طبیعت سے بلند کر کے دکھائے یا اس پر پردہ ڈال دے۔ میں عیب کو عیب کہنے پر مرحوم کی زندگی میں بھی مرکزِ خفگی بن چکا ہوں بقولِ مرحوم ؎

مَیں کو اچھا نہیں کہنے کا بس یاغی ہی سہی سرخ پانی سے ہے بہتر مجھے کالا پانی

میرے خیال میں اکبر کے کلام میں جو کمزوریاں ہیں ان کو صراحت سے پیش کرتا ہوں۔

کلام میں سستی اور ڈھیلا پن

کلامِ اکبر میں بعض بعض جگہ محض الفاظ کی بہار اور معانی کی خزاں ہے کوئی بات نظم میں ادا کرنے کے قابل ہو یا نہ ہو، موقع کہنے کا ہو یا نہ ہو، مرحوم کو کہے جانے کی ایک عادت ہو گئی تھی شعرا کی اس عادتِ بد پر خود اعتراض کرتے تھے ؎

حضرت کی شعر گوئی کچھ مستند نہیں ہے کہنے کی ایک حد ہے بکنے کی حد نہیں ہے

مگر خود اس جہلِ مرکب سے بچ نہ سکتے تھے اور زیادہ گوئی کو بکنے کی حد تک پہنچا دیتے

تھے ۔ مثلاً ؎

زحمین پکاری کہ نیدھا ہوا عجب جانور ہی یہ کاکا توا
زرا دیکھنا عقل ہی میری گم کدھر چونچ ہی اور کدھر اس کی دم

دیکھ کر مجھ کو وہ کہتے ہیں کہ اچّھے تو رہے زندہ ہیں سانس لیے جاتے ہیں اچّھے کیا ہیں

اسکیم کا جھولنا وہ جھولیں لیکن یہ کیوں ایسی راہ بھولیں
دوسرے مصرع میں پورا ایک دو حرفی لفظ "کیوں" تقطیع سے گرتا ہی ۔
ایمان پہ ہی قائم جو رہا پیدا ہوئی آخر شکل کوئی بالکل ہی اسکول اس میں جو نہ ہو پھر دائرۂ تحقیق کہاں
پہلے مصرع کے حصّۂ اول کی تعقید لفظی بالائے طاق مطلب کی حد تک خدا جانے ۔ ع
یہ شاعری ہی کہ ہذیان ہی بوقتِ بخار
کالج و اسکول کی بجتی ہی ہر سو تومڑی چار دونی آٹھ ہیں اور فاکس معنی لومڑی
حقیقت میں کہنے والے نے سچ کہا ہی کہ :
بے کار مباش کچھ کیا کر ، کپڑے پھر اُدھیڑ کر سیا کر
مرحوم کے کلام کا کچھ حصّہ محض تراکیب کی عجوبگی ، قافیہ پیمائی کی دُھن اور لفظی رعایتوں کے شوق کے باعث بگڑا ہی مثلاً ؎
یہ چائے ہرگز نہیں ہی کافی نہیں ہی لمیٹڈ کا بندہ قائل
شراب ہی حلق سے نہ اتری تو شیخ صاحب نے پھر پیا کیا
محض لمیٹڈ شراب اور چائے کی رعایت کی خاطر کافی لائے ہیں اور ظاہر ہی کہ اسی آورد کے باعث پہلا مصرع روانی سے کافی محروم ہو گیا ۔
شیخ صاحب جمعبندی میں نہ کیوں الجھے رہیں ہند کا اسلام بھی کھیوٹ میں داخل ہو گیا
دوسری جگہ کھیوٹ پرست کہ کر فارسی ہندی کا پیوند لگایا ہی ؎

محوِ اضافہ وہ بتِ کھیوٹ پرست ہی　　کہتا ہی عاقبت کا یہی بندوبست ہی

زندگی سے میرا بھائی سیر ہی　　پھر بھی خوراک اس کی ڈھائی سیر ہی

خوراک کی مشدّد رے یا "ک" کا گرجانا اکبر کی بلا جانے اُن کو "ڈھائی سیر" کا قافیہ "بھائی سیر" لانے کی دُھن تھی، وہ پوری ہوگئی۔

ہوئی جب آمدِ پیری ہُوا یں سرکہ پیشانی　　ترش رُوی کی چٹنی جوڑ ہی ڈاڑھی ہو جب کھچڑی

صنعتِ مراعاۃ النظیر کی ضیافتِ طبع کے واسطے جو دسترخوان بچھایا گیا ہی اس پر سرکہ ترش چٹنی اور کھچڑی کے سوا اور کیا ہی -

انوکھے ہیں مشاغل حضرتِ اکبر کے ان روزوں　　الم ترکیف بیٹھے پڑھ رہے ہیں فیل خانے میں

الم ترکیف کی رعایت سے فیل ضرور آگیا مگر حسنِ مطلب ہرن ہوگیا۔

بھنڈار سے دے دوں گا بہ خوشی سیدھا جو گرُوجی مانگیں گے

ہاں کام ذرا ٹیڑھا ہوگا بسکٹ کو جو سوُجی مانگیں گے

علانیہ ظاہر ہورہا ہی کہ سیدھے ٹیڑھے کے شوقِ تضاد اور قافیے کی خواہش نے شعر لکھوایا ہی ورنہ گرُوجی کو سوُجی سے کیا تعلق -

زور پر ہی شہر میں طاعون چارہ کیا کروں　　لاٹ صاحب تک ہیں جب پھر میں بچارہ کیا کروں

اس میں کھلا ہوُا قافیے کا عیب ہی بچارہ اور چارہ میں حرف روی ہی غائب ہی آخر مصرع کی بچارہ کی "ب" کو حرف روی مانا جائے تو اول مصرع میں طاعون کے "ن" کو حرف روی نہیں کہا جاسکتا اس لیے کہ یہاں نون ساکن ہی اور حرف روی کو "ب" کی طرح متحرک ہونا چاہیے۔

جانستانی میں نہ چھوڑے گا دقیقہ باقی　　دل ستانی کے لیے لافِ وفا مارے گا

اس شعر میں جاں ستانی اور دل ستانی کے کھیل کے سوا کچھ نہیں ہی دوسرے لاف زدن فارسی محاورہ ہی اُردو میں لاف مارنا نہیں آتا۔ شیخی مارنا آتا ہی۔

خیالات و تراکیبِ غیر سے استفادہ

ایسا کلام کئی اجزا میں منقسم کیا جا سکتا ہے، ایک حصّہ وہ ہے جس میں دوسرے شعرا کے مشہور اشعار کو بطورِ تفنّن اپنے رنگ میں رنگا ہے اور مضمون میں بجز طفلانہ نقالی کے کوئی خاص ترقی پیدا نہ کر سکے جیسے حضرت حافظ رح کا شعر ہے ؎

الا یا ایہا الساقی اَدِر کاساً و ناوِلہا ۔۔۔ کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکل ہا

اس کو جنگ کے زمانے میں چرچل صاحب وزیر سے مخاطبت کرتے ہوئے یوں بدل دیا ؎

الا یا ایہا الچرچل نظر کن سوے ساحل ہا ۔۔۔ کہ جنگ آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکل ہا

نظر کن سوے ساحل ہا کہہ کر کیا نئی بات پیدا کی۔ ساحل کا ایک بیکار قافیہ پڑا سا مل گیا اس کو باندھ دیا ایک آدھ لفظ کی ترمیم کر کے ہر طفلِ مکتب ہر جنگ کے موقعہ پر کہہ سکتا ہے ؎

الا یا ایہا الجاپاں نظر کن سوے ساحل ہا ۔۔۔ کہ جنگ آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکل ہا

پختہ عمری میں ایسی طفلانہ کوششیں کلام کی وقعت کو اس کی جائز رفعت سے نیچے گرا دیتی ہیں۔ بعض شاعرانہ خیالات مرحوم نے بالیقین دوسرے اساتذہ سے لیے ہیں اور بغیر کسی نمایاں تغیّر کے ان کو اپنی طرف سے ایسا پیش کر دیا ہے گویا یہ کسی اور کے مرہونِ منّت نہیں۔ میں نے اپنی مدّتِ ملاقات میں بجز ایک اس شعر کے کہ ؎

کرتا ہوں ہر اینٹ پر نوحے رکا رہتا ہے کام ۔۔۔ تنگ ہے وہ شوخ مجھ تاریخ داں مزدور سے

جو کسی ایرانی کے اس شعر سے متاثر ہو کر کہا گیا ہے ؎

ہر کجا افتادہ بینی خشت در ویرانۂ ۔۔۔ ہست فردے دفترے احوالِ صاحب خانۂ

اور اسلوب و مضمون ہر دو میں اچھا تغیّر کر دیا ہے کسی موقعہ پر مرحوم کو اس کا اعتراف کرتے نہ سنا کہ ان اشعار میں وہ فلاں شعرا کے خیالات کے زیرِ بارِ احسان

ہیں میں نے کبھی کبھی دوسروں کا ملتا جلتا مضمون بنا دیا تو یہ کہہ دیا کہ مجھے معلوم نہ تھا یا بالکل خاموش ہو گئے اور بات کو اُڑا دیا مثلاً ایک منظوم خط مشہور ہے جو ایک مریض نے کمزوری . . . کی شکایت میں دہلی کے مشہور طبیب کو لکھ کر منظوم جواب حاصل کیا تھا اسی خط کا ایک شعر ہے ؎

خروس وار سحر خیز بودہ دحالا   چو ماکیاں ز سرِ بیضہ بر نمی خیزد

غالباً اکبر نے خروس و سحر خیزی کا مضمون وہاں سے اُڑایا اور اس کو اس شعر کی شکل میں ادا کر دیا ؎

سول سرجن تو ساڑھے آٹھ سے پہلے نہیں اٹھتے   ولیکن اُن کے مرغے کی سحر خیزی نہیں جاتی

بن گئی ہے خضرِ راہِ دوستاں کیدِ حریف   ہے نمازِ گریۂ زاہد سے خوش کبکِ نحیف

حضرت حافظ شیرازی کی اسی آواز کی بازگشت ہے کہ ع

غرہ مکن کہ گریۂ زاہد نماز کرد

یا مرحوم کا یہ شعر ؎

امتیازِ حسرت و رنج و الم جاتا رہا   غم ہوا اتنا کہ اب احساسِ غم جاتا رہا

مولوی امیر احمد صاحب امیر بدایونی کے اس مشہور شعر کا چربہ ہے ؎

امتیاز الم و جور و ستم بھی نہ رہا   کثرتِ غم سے اب اندازۂ غم بھی نہ رہا

یہ شعر ؎

عشق میں حسنِ بتاں وجہ تسلّی نہ ہوا   لفظ چمکا مگر آئینۂ معنی نہ ہوا

غالب کے اس شعر کی ایک کھلی ہوئی شکل ہے ؎

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا   ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

مرحوم کے کلام کے بعض حصص میں تراکیب اور بندشوں وغیرہ کے مدِّ نظر غالب کا صاف اتباع معلوم ہوتا ہے مثلاً ؎

کون و مکان ظہورِ جمالِ حضور ہے   غافل اسیرِ دامِ فریبِ شعور ہے

انگریزی الفاظ کی بھرمار

یہ انیسویں صدی کے انگریزی اقتدار سے مرعوبیت کا اثر تھا یا محض ہمہ دانی کا اظہار کہ اس زمانے میں مشرقی السنہ کے ماہر ہمارے کئی بلند پایہ ادیب جن کے اسالیب بیان پر اُردو ادب کو ناز ہے ایسے گزرے ہیں کہ فارسی عربی میں کامل دست گاہ رکھنے کے باوجود اپنی تقریر و تحریر میں انگریزی الفاظ و تراکیب کا کثیر استعمال ناگواری اور اعتراض کی حد تک کرتے تھے۔ جن موقعوں پر اُردو بندشوں سے بہ سہولت کام چل سکتا تھا وہاں بڑے بڑے اور غیر مانوس انگریزی الفاظ لاتے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد مولانا تھے شمس العلما تھے، حافظ قرآن تھے۔ ان کی تقاریر کا مجموعہ دیکھیے تو سرورق پر کتاب کا نام لکچرس نظر آئے گا اور اس میں اُردو زبان ایسی ملے گی "فاؤنڈر آف اسلامیہ کالج کس کو کہا جائے مسلمانانِ پنجاب ہی اس کے فاؤنڈر ہیں کالج بند ہو جائے گا تو وہی دو دھاوٹ اپنی ایجوکیشن دنیا میں فضیحت ہوں گے۔ اسلامیہ کالج کا کریڈٹ انھی کو مل رہا ہے۔ یہ کالج تو تھا ایسے سر پڑا ہے اب تمھاری آنر (Honour) اس کے ساتھ وابستہ ہو چکی ہے۔ اپنی آنر کو ونڈی کیٹ (Vindicate) کرو رفنڈس کے جمع ہوئے پیچھے اُن کا ہینڈل (Handle) کرنا جمع کرنے سے زیادہ مشکل ہے" نذیر احمد ڈپٹی کے یہاں نثر میں تو اکبر کے یہاں نظم میں قدم قدم پر اس میلان کا ثبوت ملتا ہے کہ اکبر کے نزدیک ہند کے پرزوں کے مقابلے میں "ولایت ہی کا مال اچھا ہے" کلام میں رفارمر (Refarmer) آنر (Honour) بیف (Beef) ٹچ (Touch) پوائنٹ (Point) پارک (Pork) بیلون (Baloon) مس ڈی سوزا (Missd'souza) ایرشپ (Airship) وغیرہ اس

کثرت سے غیر مانوس انگریزی الفاظ نظر آتے ہیں کہ طبیعت بار محسوس کرتی ہے اس پر ایجادِ بندہ عجوبہ اضافتیں و تراکیب ذوقِ سلیم کا خون کرتی ہیں، ووٹ بازی مسٹر نقلی، باگزٹ، بے ممبری، گزیٹڈ جنوں، بنی کالج، شوقِ ڈنر (Dinner) رفل بدست، موٹر نوازی وغیرہ۔ اکبر کی بریت میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ نقلِ کفر محض تفنن ہے لیکن قابلِ غور امر یہ ہے کہ نفسیاتی حیثیت سے طبائع پر اس کا اثر کیا ہوتا ہے۔ ہکلوں اور توتلوں کی نقل کرنے والوں کو دیکھا گیا ہے کہ بالآخر خود ہکلے اور توتلے ہو گئے۔ جو بات نقل و ضحکے کے طور پر بکثرت کی جاتی ہے وہ ایک عرصے کے بعد نفس میں پیوست ہو کر جزوِ طبیعت بن جاتی ہے۔ اکبر کے کلام میں انگریزی اضافتوں الفاظ اور تراکیب کی بہتات ملاحظہ ہو۔

(۱) قائم بھی بوٹ اور موزہ رکھیے دل کو مشتاقِ مس ڈسوزا رکھیے

(۲) پوائنٹ یہ سخت ہے اسے ٹچ نہ کرو۔

(۳) تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو

(۴) ایرشپ سے ہم پناہ اے چرخ پائیں گے کہاں

(۵) منہ بند ہو سکے گا کہاں شریف کا چسکا مگر نہ جائے گا صاحب سے سیفٹی کا

(۶) بیلون (Baloon) میں وہ کریں خدا سے باتیں۔

(۷) ووٹ بازی پر مگر یہ ہند عادی ہو چکی

(۸) لیڈروں کی دھوم ہے اور فالوور کوئی نہیں سب تو جنرل ہیں یہاں آخر سپاہی کون ہے

(۹) مسٹر نقلی کو عقبیٰ میں سزا کیسی ملی۔

(۱۰) بے گزٹ ہو کے جو رہیے تو محلے میں حقیر باگزٹ ہو کے جو چلیے تو فرشتوں میں خفیف

(۱۱) بے ممبری جو اچھلے سمجھا اس کو خون اچھا یہ بجا ہے قولِ شاعر گزیٹڈ جنون اچھا

(۱۲) پانو ہیں تو مہندی ہے لگی شوقِ ڈنر کی۔

(۱۳) مشکل تو یہ ہے لیکن ادھر آنر بھی ہے اور تنخواہ بھی ہے۔

(۱۴) شوقِ لیلائے سول سروس نے اس مجنوں کو   اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

(۱۵) سگِ بد زبان و نشہ می رفل بدست و غرور در سر

(۱۶) جب لیا لیسنس وہ رعبِ رفل جاتا رہا

(۱۷) گردن ریفارمر کی ہے ایک سمت تن گئی

(۱۸) مگر وہ پلیڈر سے لیڈر ہوئے۔

مخرب اخلاق مضامین قوم کی خوش بختی یا بد قسمتی سے حال میں اُردو ادب کا خادم ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا جو ہر گندگی اور بے حیائی کو اس فلسفیانہ نظریے کے تحت کہ غیرت اور بے غیرتی اضافی امور ہیں اور غلط تخیلات پر مبنی آرٹ قرار دے کر بہ بانگِ دہل بیان کرتا ہے۔ میرے محب مولوی عظمت اللہ خاں مرحوم (معتمد کمشنر امتحانات سرکار آصفیہ) اس خیال کے بڑے مؤید تھے اور بحث کرتے رہتے تھے کہ خاص خاص نام نہاد گندے الفاظ و خیالات جن کو مہذب دنیا نمایشی شرم کے تحت زبان پر نہیں لاتی ادب میں علانیہ استعمال ہونے چاہییں، غالباً ایسے لوگوں کو ادب میں بے ادبی کی سند جان صاحب جرکیں اور اکبر جیسے بزرگوں سے ہاتھ آئی ہے۔ اس وقت میں اکبر کے رکیک اور غلیظ اشعار کی صراحت کر کے مہذب لوگوں کی آنکھیں جھکانا یا معائب کو فیشن بنانا نہیں چاہتا اس خصوص میں اپنا خیال اور اکبر مرحوم سے اختلاف کا حال متنِ کتاب میں واضح کر آیا ہوں۔ یہاں محض چند مزید اشعار نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں ؎

وصل کے بعد ٹھینگا ہو کہہ کر   میں ہوا ان سے رخصت اے اکبر

اقتضا فطرت کا رکتا ہے کہیں اے ہمنشیں   شیخ صاحب کو بھی آخر کارِ شب کرنا پڑا

سینۂ بت کا اُبھار ای دلِ فسادانگیز ہی — لوگ سچ کہتے ہیں بادنجان بادانگیز ہی

سینے پہ بتوں کے دسترس مشکل ہی — پوائنٹ یہ سخت ہی اسے ٹچ نہ کرو

لپٹ بھی جا ارے اکبر غضب کی بیوٹی ہی — نہیں نہیں پہ نہ جا یہ حیا کی ڈیوٹی ہی

کر پیچ تو عشق کے اکھاڑے میں ہزار — یہ بت تو بزورِ زر ہی چت ہوتے ہیں

شرر بدایونی کو بھی اپنی واسوخت میں یہی موقع پیش آیا ہی دیکھیے زنانِ بازاری کی فطرت کو کس مہذب پیرایے میں ادا کر گئے ہیں ؎

الفت و مہر کے اظہار تو کم ہوتے ہیں — نقشِ حب ان کے لیے نقشِ درم ہوتے ہیں

بدگماں ہر گز نہ ہوں وہ ہم جواُن کو چت کریں — ہی فقط یہ مدعا ان کی کمر ثابت کریں

خدا جانے اس کشتم کشتا سے کمر ثابت ہوتی ہی یا اور ٹوٹتی ہی۔

شیخ صاحب کی کمر جھک گئی پر دل نہ جھکا — آج تک شوقِ سقنقور چلا جاتا ہی

اگر بات صرف شیخ صاحب کے "کارِ شب" کا مذاق اڑانے کی حد تک ہوتی تو کچھ گوارا کی جاسکتی تھی لیکن برہنگی دیکھیے کہ شیخ صاحب کی زوجۂ محترمہ کا شوق کس جوش کے ساتھ پیش کیا گیا ہی ؎

بی شیخانی بھی ہیں بڑی ذی ہوش — کہتی ہیں شیخ سے بجوش و خروش

خواہ لنگی ہو خواہ ہو تہہ بند — در عمل کوش ہر چہ خواہی پوش

کاش ایسا مخربِ اخلاق حصہ اکبر جیسے مصلح کے کلام میں نہ ہوتا مگر ایک انگریزی مثل ہی

There is no use crying Over spilt milk

گرے دودھ پر آنسو بہانے سے نتیجہ کیا ؎

دل سے کہتا ہوں کہ ہاں شمع بصیرت نہ بجھے
وقت سے کہہ نہیں سکتا کہ شبِ تار نہ ہو

تاریخِ تصنیفِ کتاب ہذا

از

مولوی مجتہد الدین صاحب عیش بدایونی

مطلوب ملک کو تھی جو سیرتِ منوّر
لکھ دی قمر نے کیسی بے مثل اور بہتر
تاریخ بھی چمکتی اے عیش ہاتھ آئی
روشن کیا قمر نے نامِ جنابِ اکبر

۱۳۵۷ھ

تاریخِ تکمیلِ کتاب ہذا

از

مولوی تمنا حسین صاحب تمنا بدایونی

اُردو کو چار چاند قمر نے لگا دیے
کہتا ہے دل کمالِ سخنور کہو اسے
کیا خوب حالِ حضرتِ اکبر کیا رقم
آئینۂ حیات کا جوہر کہو اسے

تاریخ کے لیے ہے تمنا یہ فکر کیوں
لکھی قمر نے سیرتِ اکبر کہو اسے

۱۳۵۸ھ

نُصرتی

گیارھویں صدی ہجری کے نامور اور باکمال شاعر ملا نصرتی ملک الشعرا ے بیجاپور کے حالات اور کلام پر تبصرہ۔ تالیف لطیف ڈاکٹر مولانا عبدالحق صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند)

یہ علمی تحقیق و تفحص کا بہترین کارنامہ ہے۔ نُصرتی قدیم دکنی اُردو کا استاد کامل گزرا ہے، رزمی اور بزمی ہر قسم کی شاعری میں کمال رکھتا تھا۔ علی نامہ، گلشن عشق، تاریخ سکندری دیوان قصائد و غزلیات اس کی مشہور تصانیف ہیں جن میں علی نامہ اور تاریخ سکندری کو عادل شاہیوں کی تاریخ کے بہترین ماخذوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

نُصرتی کی زبان چونکہ قدیم دکنی ہے اس لیے اب ان تصانیف کا سمجھنا محال ہو گیا ہے لیکن اسے محنت اور شوقِ تحقیقات کی کرامت سمجھنا چاہیے کہ فاضل مولف نے اس متروک زبان کے تمام ادق الفاظ کے معنی دریافت کر لیے۔ کتاب میں مختلف اصناف کلام کے جو نمونے نقل کیے ہیں ان کے نیچے اشعار کا مطلب صاف اُردو میں تحریر کر دیا ہے۔ اُردو کی تاریخ اور قدیم زبان کی تحقیقات کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے یقین ہے کہ یہ کتاب زبان اردو کی بہترین محققانہ علمی تصانیف میں شمار ہوگی۔

ایک نادر مرقع عادل شاہی دربار کا دستیاب ہوا تھا۔ اس کی رنگین اور چند سادہ تصاویر سے کتاب کی زینت دوبالا ہو گئی ہے۔ حجم تقریباً ساڑھے تین سو صفحات، قیمت مجلد تین روپے چار آنے۔ بلا جلد تین روپے۔

اکبر الہ آبادی کے اُستاد حضرت وحید کے کلام کا انتخاب۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔
قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے، بلا جلد ایک روپیہ۔

ملنے کا پتا ۔ انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی

مفید عام پریس لاہور میں باہتمام لالہ موتی رام منیجر چھپی اور
سید صلاح الدین جمال الدین [illegible]

نُصرتی

گیارھویں صدی ہجری کے نامور اور باکمال شاعر مُلّا نُصرتی ملک الشعرا سے بیجاپور کے حالات اور کلام پر تبصرہ۔ تالیف لطیف ڈاکٹر مولانا عبدالحق صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند)

یہ علمی تحقیق و تفحص کا بہترین کارنامہ ہے۔ نُصرتی قدیم دکنی اُردو کا استاد کامل گزرا ہے۔ رزمی اور بزمی ہر قسم کی شاعری میں کمال رکھتا تھا۔ علی نامہ، گلشنِ عشق، تاریخ سکندری دیوان قصائد و غزلیات اس کی مشہور تصانیف ہیں جن میں علی نامہ اور تاریخ سکندری کو عادل شاہیوں کی تاریخ کے بہترین ماخذوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

نُصرتی کی زبان چونکہ قدیم دکنی ہے اس لیے اب ان تصانیف کا سمجھنا محال ہو گیا ہے لیکن اسے محنت اور شوقِ تحقیقات کی کرامت سمجھنا چاہیے کہ فاضل مولف نے اس متروک زبان کے تمام ادق الفاظ کے معنی دریافت کر لیے۔ کتاب میں مختلف اصناف کلام کے جو نمونے نقل کیے ہیں ان کے نیچے اشعار کا مطلب صاف اُردو میں تحریر کر دیا ہے۔ اُردو کی تاریخ اور قدیم زبان کی تحقیقات کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ یقین ہے کہ یہ کتاب زبان اردو کی بہترین محققانہ علمی تصانیف میں شمار ہوگی۔

ایک نادر مرقع عادل شاہی دربار کا دستیاب ہوا تھا۔ اس کی رنگین اور چند سادہ تصاویر سے کتاب کی زینت دوبالا ہو گئی ہے۔ حجم تقریباً ساڑھے تین سو صفحات،

قیمت مجلد تین رُپے چار آنے۔ بلا جلد تین رُپے۔

اکبر الہ آبادی کے اُستاد حضرت وحید کے کلام کا انتخاب۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔

قیمت مجلد ایک رُپیہ چار آنے ؛ بلا جلد ایک رُپیہ۔

ملنے کا پتا — انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

مفید عام پریس لاہور میں باہتمام لالہ موتی رام منیجر چھپی اور
[illegible]